اَندر کا مُسافر

سعیدہ خاتون عظیمی

الکتاب پبلیکیشنز، اشرف منزل، I-K 5

اشاعت ــــــــــــــــــ ۱۹ اپریل ۱۹۹۷ء

کمپوزنگ ــــــــــــ اقبال لیزر کمپوزنگ ، کراچی

دیباچہ

حضرت ابراہیم ادھمؒ شاہانہ عظمت و جلال کے ساتھ تختِ شاہی پر جلوہ افروز تھے۔ وزراء و اُمراء اور حشم و خدام دست بدستہ ایستادہ تھے۔ شاہی دربار میں عوام کا ایک جمِ غفیر تھا۔ رعب شاہی سے دربار میں سناٹا تھا کہ ایک شخص دربار میں داخل ہوا۔ اس شخص کا لباس موٹے کھدر کا ایک چولا تھا اور پیر مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے۔ بالوں میں گرد و غبار کی طرح تھی کہ وہ شخص دربار سے گزرتا ہوا تختِ شاہی کے روبرو آ کھڑا ہوا۔ حضرت ابراہیم ادھمؒ نے پوچھا:

''تم کون ہو۔''

اس آدمی نے کہا۔ ''میں مُسافر ہوں''

بادشاہ نے فرمایا،

''ہم نے اپنی سلطنت میں مُسافر خانے تعمیر کرائے ہیں تا کہ مسافر اس میں راحت و آرام پائیں۔''

شخص مذکور نے کہا،

''یہ دربار بھی تو مسافر خانہ ہے۔''

حضرت ابراہیم ادھمؒ نے فرمایا،

''یہ دربار شاہی ہے مسافر خانہ نہیں ہے۔''

اس شخص نے سوال کیا،

''اس تخت پر آپ سے پہلے کون براجمان تھا؟''

حضرت ابراہیم ادھمؒ نے فرمایا،

''میرا باپ''

اس شخص نے پوچھا،

''آپ کے والدِ ماجد سے پہلے یہ تخت کس کے قبضے میں تھا؟''

حضرت ابراہیم ادھمؒ نے فرمایا،

''میرے دادا کے زیرِ تصرف تھا۔''

اس شخص نے کہا،

''اس سے پہلے''

حضرت ابراہیم ادھمؒ نے کہا،

''اس سے پہلے اس شخص کے پاس سلطنت تھی جس سے میرے پرکھوں نے یہ سلطنت حاصل کی۔''

وہ شخص بولا،

''پھر مسافر خانہ کسے کہتے ہیں؟''

یہ کہہ کر وہ شخص جس شانِ بے نیازی سے دربار میں داخل ہوا تھا اسی شان عظمت سے دربار سے نکل گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لئے پا پیادہ مسافر تھے کہ ایک یہودی قریب آیا۔ اس نے کہا میں بھی آپ کے ساتھ شریک سفر ہونا چاہتا ہوں۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ یہاں تک کہ سورج نصف النہار پر آ گیا۔ تمازت اور دھوپ کی شدت سے بچنے کے لئے دونوں نے ایک شجر سایہ دار کے نیچے قیام کیا۔ گرمی کی شدت کم ہوئی تو بھوک لگی۔ دونوں نے اپنے اپنے دسترخوان کھولے۔ یہودی کے دسترخوان میں تین روٹیاں تھیں اور حضرت عیسیٰؑ کے دسترخوان میں دو روٹیاں تھیں۔ یہودی کے دل میں خیال آیا کہ مجھے آدھی روٹی حضرت عیسیٰؑ کو دینا پڑے گی۔ اس نے جلدی سے دسترخوان لپیٹا اور کہا کہ کھانے کے ساتھ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ اگر پانی لے آئیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ حضرت عیسیٰ پانی لینے گئے اور یہودی نے تین میں سے ایک روٹی کھالی۔ جب دونوں کھانے بیٹھے تو عیسیٰؑ نے فرمایا کہ تمہارے دسترخوان میں تین روٹیاں تھیں۔ یہودی نے جلدی سے کہا۔ نہیں دو تھیں۔ حضرت عیسیٰ خاموش رہے اور یہودی کھانا کھانے کے بعد سو گیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے ریت کی تین ڈھیریاں بنائیں اور ان پر کلامِ الٰہی پڑھ کر پھونکا۔ تینوں ڈھیریاں سونا بن گئیں۔ یہودی جب سو کر اُٹھا تو دیکھا سامنے سونے کی تین ڈھیریاں ہیں۔ اس نے کہا۔ اے عیسیٰ! یہ سونے کی تین ڈھیریاں کس کی ہیں؟ حضرت عیسیٰؑ نے کہا۔ ایک تیری ہے اور ایک میری ہے اور تیسری اُس کی ہے جس نے تیسری روٹی کھائی ہے۔ یہودی نے کہا وہ تیسری روٹی میں نے کھائی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یہودی نے کہا۔ اے عیسیٰ! آپ برگزیدہ بندے اور پیغمبر ہیں۔ آپ کا سونے چاندی کے ڈھیر سے کیا تعلق۔ یہ دونوں ڈھیریاں آپ مجھے عنایت فرما دیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا، سفر کرتے وقت ہم نے معاندہ کیا تھا کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ سفر کریں گے۔ اگر تو اس معاندے کو توڑ دے تو یہ سب سونا تیرا ہے اور اپنی گلیم اُٹھائی اور وہاں سے رخصت ہوئے۔ ابھی یہودی سونے کی ڈھیریوں کو سمیٹنے بھی نہ پایا تھا کہ تین مضبوط اعضاء کے جوان وہاں آ گئے اور انہوں نے بھی یہی سوال کیا کہ یہ سونا کس کا ہے؟ یہودی نے کہا میرا ہے۔ ان تین مسافروں نے کہا تیرا کس طرح ہے۔ ہم تین مسافر ہیں۔ یہودی بہت چلایا۔ غضبناک ہوا۔ بُرا بھلا کہا اور پھر خوشامد پر اتر آیا۔ وہ تین مسافر ڈاکو تھے۔ ڈاکوؤں کے سردار نے یہودی سے کہا یہ پیسے لو اور ہمارے لئے شہر سے کھانا لے آؤ۔ ہم بھوکے ہیں۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ

کی یا مخبری کی تو ہم تمہیں اس سونے کی ڈھیریوں سے ایک نہیں دیں گے۔ یہودی انہیں کوستا ہوا شہر چلا گیا۔ وہاں سے کھانا خریدا اور اس کھانے میں زہر ملا دیا تا کہ وہ تینوں زہریلا کھانا کھا کر ہلاک ہو جائیں اور سونے کی تینوں ڈھیریاں یہودی کی ملکیت ہو جائیں۔ جیسے ہی وہ کھانا لے کر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین پر کھانا رکھے۔ ان میں سے ایک ڈاکو اٹھا میان سے تلوار نکالی اور یہودی کا سر قلم کر دیا۔ تینوں بہت خوش تھے کہ کباب میں سے ہڈی نکل گئی۔ تینوں نے کھانا کھایا اور تینوں وہیں ڈھیر ہو گئے۔ تیز آندھی آئی اور سونے کی ڈھیریوں کو نہیں معلوم کہاں لے جا پھینکا۔

سکندر بادشاہ جس کو ساری دنیا کا فاتح بادشاہ کہا جاتا ہے۔ برسوں اپنے ملک سے باہر رہا تو فوج نے بغاوت کر دی کہ اب ہم آگے نہیں جا سکتے۔ طوعاً و کرہاً بادشاہ نے واپسی کا ارادہ کیا۔ راستے میں اسہال کے مرض میں مبتلا ہوا۔ حکیموں نے ہر طرح کا علاج کیا لیکن فائدہ نہ ہوا۔ ایک دن سکندر نے حکیموں کے حکیم کو بلا کر سرزنش کی کہ تم مجھے ٹھیک نہیں کر سکتے۔ حکیم کو یہ بات ناگوار گزری۔ اس نے بلور کا ایک بڑا پیالہ منگوایا۔ اس میں پانی بھرا اور اپنی صندوقچی میں سے ایک پڑیا نکال کر پیالہ میں ڈال دی۔ پڑیا میں سفوف جیسے جیسے پانی کی تہہ نیچے اترتا گیا تو ساتھ ساتھ پانی جم گیا۔ حکیم نے بادشاہ سے کہا۔ بادشاہ سلامت آپ کا اقبال بلند ہو۔ آپ کو اللہ صحت دے۔ میں آپ کو ایسی سترہ پڑیاں کھلا چکا ہوں۔ دوا کی ایک پڑیا کا وصف آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہے۔

جب علاج کارگر نہ ہوا اور سکندر بادشاہ نزع کے عالم میں چلا گیا۔ اب نئی افتاد یہ پڑی کہ کسی طرح اس کا دم نہیں نکلتا تھا۔ فوج میں لوٹ مار اور بغاوت کے آثار ہو گئے تو امراء سلطنت سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ وہاں ایک قلندر شعور کے حامل بندے نے کہا، کسی اللہ والے کو تلاش کرنا چاہئے۔ وہاں سے ہی رہنمائی ملے گی۔ خدمت گار تلاش میں دوڑ پڑے اور ایک بزرگ انہیں بیابان جنگل میں جھونپڑی میں بیٹھے مل گئے۔ انہوں نے سارا ماجرا سن کر کہا، بادشاہ کی جان اسکے اموال اور زر و جواہرات میں اٹکی ہے۔ جو اس نے ظلم و تعدی سے لوگوں سے چھینے ہیں۔ ایسا کیا جائے کہ اس سارے مال و اسباب کی نمائش لگائی جائے اور ایک سرے سے دوسرے سرے پر بادشاہ کو تختے پر لٹا کر اسے دکھایا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ بادشاہ نے جب یہ دیکھا کہ سارا مال و اسباب موجود ہے اور ایک سے دوسرے سرے پر پہنچا تو اس کا دم نکل گیا۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ وہ ساتھ کچھ نہیں لے کر گیا۔ یہ بھی ایک سفر ہے۔ جو سکندر بادشاہ نے زمین پر کیا اور زمین کی تہوں میں اتر کر مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو گئے۔ اب اسی سکندر بادشاہ کا جسم جو مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو گیا ہے دنیا کے مسافر اس پر چلتے پھرتے ہیں اور سکندر بادشاہ کے جسم کے ذرات کو پیروں میں روندتے ہیں۔

یہ دنیا ایک مسافر خانہ ہے۔یہاں جو بھی آیا ہے وہ مسافر کی حیثیت سے آتا ہے اور جب اس کا سفر ختم ہوتا ہے تو آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ہم زمین کو مسافر خانہ کہتے ہیں۔زمین بھی حضرت ابراہیم ادھمؒ کے دربار کی طرح ایک بڑا دربار ہے۔یہ اتنا بڑا دربار ہے جہاں لاکھوں سال میں نہیں معلوم کتنے بادشاہ مسافروں کی طرح آئے ،مسافروں کی طرح رہے اور مسافروں کی طرح اس دربار سے چلے گئے۔مسافر خانہ ایک ہے۔سفر بھی ایک ہے۔منزلیں بھی متعین ہیں۔لیکن مسافر خانے میں کانٹے بھی ہیں۔پھول بھی ہیں۔غزل خواں قمریاں بھی ہیں۔درخت بھی ہیں۔برف پوش پہاڑیاں بھی ہیں۔یہاں نفرت کے الاؤ بھی جلتے ہیں اور محبت کے پھول بھی نچھاور ہوتے ہیں۔بات یہ نہیں ہے کہ ہم دنیا کو مسافر خانہ نہ کہیں۔دنیا مسافر خانہ تو ہے لیکن اس میں رہنے والوں کی الگ الگ قسمیں ہیں۔جتنی قسمیں ہیں اتنے ہی گروہ ہیں۔گروہ میں کوئی گروہ چنگیز خان ہے۔کوئی گروہ حاتم طائی ہے۔کوئی شداد نمرود ہے اور کوئی گروہ اللہ کا پسندیدہ گروہ ہے۔جو گروہ اللہ کا پسندیدہ ہے اس گروہ پر رحمتیں بارش بن کر برستی ہیں۔وہ اس مسافر خانہ (دنیا) میں بھی عذاب النار میں مبتلا ہیں۔مسافروں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ کی مخلوق کیلئے اللہ کی رحمت ہے۔یہ گروہ لوگوں کو اس کی طرف بلاتا ہے۔اور مسافر خانے کے ان حصوں سے باخبر کرتا ہے۔جہاں لوگوں پر حزن و ملال نہیں ہوتا۔غم اور خوف نہیں ہوتا۔اس مقام میں رہنے والے لوگ پُرسکون رہتے ہیں۔اور دوسروں کی بھلائی چاہتے ہیں اور دنیا کو جنتِ ارضی میں تبدیل کرنے کے ناصرف خواہش مند رہتے ہیں بلکہ عملی جدوجہد کرتے ہیں۔یہ جدوجہد تقریر کے ذریعے، تحریر کے ذریعے اور تصرف کے ذریعے جاری وساری ہے اور جب تک مسافر خانہ رہے گا۔مسافر آتے جاتے رہیں گے۔

اسی گروہ میں سے ایک فرد کا نام سعیدہ خاتون عظیمی ہے۔سعیدہ خاتون عظیمی کی تحریروں اور تقریروں سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ اس خاتون نے اس حقیقت کو جان لیا ہے کہ یہ دنیا مسافر خانہ ہے اور یہاں رہنے والا ہر فرد مسافر ہے۔جب سے یہ دنیا قائم ہے قرآن کی روشنی میں اگر سمجھا جائے تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف متوجہ ہو کر غور وفکر کرنا ہوگا۔

”آسمان سے زمین کی طرف وہ ہر عمل کی تدبیر کرتا
ہے۔پھر یہ امر اس کے پاس ایک دن میں لوٹے
گا۔جس کی مقدار تمہارے شمار میں ایک ہزار سال
کی ہوگی۔“ (سورۃ الحجر)

”سو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے (مسافرت)

نہیں کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے ہیں جس سے
یہ سمجھنے لگ جاتے یا کان ایسے ہو جاتے جن سے یہ
سننے لگتے ۔اصل یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہو
جاتیں۔ بلکہ دل جو سینوں میں ہے وہ اندھے ہو
جاتے ہیں۔آپ سے یہ لوگ عذاب کی جلدی
کر رہے ہیں۔ درحالیکہ اللہ اپنے وعدے کے
خلاف نہیں کرے گا اور آپ کے پروردگار کے پاس
ایک دن مثل ایک ہزار سال کے ہے۔تم لوگوں
کے شمار کے مطابق اور کتنی ہی بستیاں تھیں جنھیں
میں نے مہلت دی تھی اور وہ نافرمان تھیں۔پھر میں
نے انہیں پکڑ لیا۔اب میری طرف واپسی۔"

مسافر کی چلت پھرت ایک گھنٹے کی ہو۔ایک دن کی ہو۔ایک ماہ کی ہو۔ایک سال کی ہو۔بہرحال مسافرت ہے۔مسافر خانہ اور مسافرت کی نسبت سے سیدنا حضور علیہ السلام کا ارشاد بہت زیادہ توجہ طلب ہے۔حضرت سعد بن وقاصؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یقیناً میں اُمید رکھتا ہوں کہ میری اُمت اپنے
پروردگار کی نظر میں اتنی عاجز اور بے حقیقت نہیں ہو
جائے گی کہ اس کا پروردگار آدھے دن کی بھی مہلت
عطا نہ کرے۔"

اس حدیث کی رُو سے دنیا (جسے مسافر خانے کے علاوہ کوئی نام نہیں دیا جاسکتا) کی عمر ڈیڑھ دن ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسافر خانہ دنیا کی عمر بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ڈیڑھ دن کی ہے۔اس ڈیڑھ دن کی تاریخ پر جب نظر ڈالی جائے تو یہاں ظلم وتشدد، حسد، جلن، نفرت کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔

سعیدہ خاتون عظیمی نے ''اندر کی دنیا کا مسافر'' کتاب لکھ کر نوعِ انسانی کو یہ بتایا ہے کہ دنیا کی عمر کتنی ہی ہو۔بالآخر اس میں رہنے والے لوگ مرکھپ جائیں گےاور ایک دن یہ مسافر خانہ بھی ختم ہو جائے گا۔اس مسافر خانے میں لوگ آتے رہتے ہیں اور کردار ادھورا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔جس روز مسافر کا کردار پورا ہو جائے گا۔مسافر خانہ نیست و نابود ہو جائے گا۔

لیکن اللہ کے ارشاد کے مطابق پھر ایک دوسرے عالم میں ہوگا اور جو اس دنیا میں کیا تھا اس کی جزا و سزا بھگتنی ہوگی۔کتاب ''اندر کا مسافر'' پڑھ کر ذہن میں لاشعوری دریچے کھلتے ہیں۔اس کتاب کے مطالعے سے مادی حواس کی درجہ بندی کا علم حاصل ہوتا ہے۔اندر باہر کی دنیا کا ادراک ہوتا ہے۔کوئی مسافر اپنی جگمگ کرتی دنیا میں تبدیل کر سکتا ہے۔

اللہ تعالٰی سعیدہ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

اور لوگوں کو ان کی اس کاوش سے فائدہ پہنچائے۔(آمین)

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی

۱۹ اپریل ۱۹۹۷ء

اس بڑے سے تین منزلہ گھر میں رہنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی ۔ایک دادی اماں تھیں ۔ جو باوجود بڑھاپے کے نہایت ہی خوش مزاج اور صحت مند تھیں ۔ دادی اماں کے دو فرزند تھے ۔ جوتن و توش میں اچھے خاصے لمبے تڑنگے تھے ۔صورت وشکل کے بھی ٹھیک ٹھاک تھے ۔ جسامت کی وجہ سے خوب رعب دار لگتے تھے ۔گندمی رنگ پر چھوٹی چھوٹی داڑھی اچھی لگتی تھی ۔ دور سے دیکھ کر کوئی بھی پہچان سکتا تھا کہ یہ آپس میں بھائی ہیں ۔ایک بیٹے کا نام سید غضنفر علی تھا اور دوسرے کا نام غفور علی تھا۔غضنفر علی بڑے تھے ۔ان کے تین بچے تھے ۔ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ۔لڑکی بڑی تھی ۔جس کا نام سمیرا تھا ۔اس کے بعد لڑکا جس کا نام سلمان تھا اور سب سے چھوٹی بیٹی کا نام ثمینہ تھا۔چھوٹے بیٹے غفور علی کی صرف ایک بیٹی تھی ۔جو ثمینہ سے چار ماہ چھوٹی تھی ۔اس کا نام راحیلہ تھا۔اس پوری بلڈنگ میں بس دادی اماں اور ان کے دو بیٹوں کی مختصر فیملی رہتی تھی ۔ بڑی بہو فرزانہ نہایت ہی خوبصورت نازک اندام تھی ۔ وہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی خوب سیرت بھی تھی ۔ اکثر وبیشتر اس کے دلنواز قہقہے گھر کے سکوت کو توڑتے رہتے تھے ۔دادی اماں تو انہیں میری بلبل کہہ کر پکارا کرتی تھیں ۔چھوٹی بہو رخشندہ بھرے ہوئے جسم کی پیاری شکل کی لڑکی تھی ۔بس ذرا خاموش طبیعت تھی ۔مگر مزاج کی بہت رحم دل اور خدمت گزار تھی ۔دادی اماں کی ایک بیٹی بھی تھی ۔ جو دونوں بھائیوں سے بڑی تھی ۔اس کا نام سیماں تھا ۔وہ بیاہ کے دوسرے شہر چلی گئی تھی ۔اس کے دو بچے تھے ۔ایک لڑکا جس کا نام وقاص تھا ۔چھوٹی بیٹی کا نام زیما تھا ۔داماد کا نام عتیق تھا۔دادی اماں اپنے بیٹوں کے ساتھ کراچی میں رہتی تھیں ۔ بیٹی داماد راولپنڈی میں رہتے تھے ۔سال میں دو مرتبہ بچوں کی تعطیلات کے دوران کراچی آجاتے تھے ۔اس طرح سب کی زندگی نہایت ہی سکون کے ساتھ گزر رہی تھی ۔

میں شروع سے ہی دادی اماں کا لاڈلہ رہا ۔اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میں تین لڑکیوں میں واحد لڑکا تھا۔ذرا آنکھ سے اوجھل ہو جاؤں تو دادی اماں کی سلمان ،سلمان...... کی پکار سے سارا گھر گونج اُٹھتا تھا۔دادا کو تو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔وہ میری پیدائش سے نو برس پہلے ہی فوت ہو چکے تھے ۔مجھے تو پیدا ہوتے ہی دادی اماں نے جیسے گود لے لیا تھا ۔ڈرائنگ روم میں ان کا ایک مخصوص صوفہ نما بیڈ تھا ۔جہاں وہ روزانہ شام کو بیٹھ کر T.V دیکھا کرتی تھیں ۔اس پر دو عدد گاؤ تکئے رکھے تھے ۔ دادی اماں بڑی سی چادر پہنے ہوتیں ۔ مجھے اپنی چادر میں ڈھانپ لیتیں ۔امی کہا کرتی تھیں کہ تم چند مہینے کے تھے کہ جب سے یہی سلسلہ چلا جا رہا تھا ۔دادی اماں تمہیں اپنی گود میں لے کر شام تک سے ہی اپنی

مخصوص جگہ پر بیٹھ جاتیں ۔ T.V تو وہ کم دیکھتی تھیں بس اپنی چادر میں چھپا کر تم سے کھیلا کرتی تھیں ۔ یہاں تک کہ تمہارے قہقہے بلند ہو جاتے اور پھر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کھیلنے کے بعد تم دادی اماں کی آغوش میں ان کی چادر کے اندر سو جاتے ۔ اب لاکھ سب لوگ دادی اماں سے کہتے کہ بچے کو نیچے سلا دیتے ہیں آپ تھک جائیں گی مگر ان کا ایک ہی جواب ہوتا جب تھک جاؤں گی بتا دوں گی اور دادی اماں کئی کئی گھنٹے تمھیں گود میں لئے بیٹھی رہتیں ۔ یہاں تک کہ T.V پروگرام دیکھ کر سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جانے لگتے ۔تب وہ بڑی آہستگی سے کہ تمھاری آنکھ نہ کھل جائے گالوں پر پیار کرتیں اور پھر میں تمھیں بیڈروم میں سلا دیتی ۔

اس طرح تین سال گزر گئے ۔ سمیرا، ثمینہ اور راحیلہ تینوں امی اور چچی کو ہر وقت گھیرے رہتیں ۔ مگر میں دادی اماں سے ہر وقت چمٹا رہتا ۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی تھیں ۔ اپنے ہاتھوں سے کھلاتی پلاتیں ۔ میں بھی دوڑ دوڑ کے ان کا کام کیا کرتا تھا ۔ تین سال کی عمر سے دادی اماں نے مجھے قاعدہ بھی شروع کرا دیا تھا ۔ گاہے بگاہے گنتی بھی سکھاتی رہتی تھیں ۔ کلمہ شریف تو میں نے دو سال کی عمر سے یاد کر لیا تھا ۔ دادی اماں کی بے پناہ محبت نے میرے اندر تابعداری کی صلاحیت بیدار کر دی ۔ اس معصوم عمر میں ان کی محبت میرے لئے سب سے بڑا سرمایہ تھی ۔ بہنوں کے ساتھ کھیل کے دوران بھی میرا ذہن دادی اماں کی طرف لگا رہتا ۔ ان کی ذرا سی آہٹ پر اپنا کھیل چھوڑ کر ان کی جانب دوڑ جاتا ۔ ایک دن سبق کے دوران دادی اماں کہنے لگیں ۔ سلمان بیٹے تم کو پتہ ہے اللہ میاں بچوں سے کتنی محبت کرتے ہیں ۔ میں نے فوراً کہا. دادی اماں جتنی آپ مجھ سے کرتی ہیں ۔ وہ خاموش ہو کر ہنس پڑیں اور میرے گالوں پر پیار کر لیا ۔ میں نے کہا ’’ دادی اماں اللہ میاں بھی بچوں کے گالوں پر پیار کرتے ہیں اور بچوں کو گود میں بٹھاتے ہیں اور مٹھائی بھی کھلاتے ہیں ‘‘ ۔ وہ بولیں ،’’ ہاں ! اللہ میاں تو سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں ۔ گود میں بٹھاتے ہیں اور مٹھائی بھی کھلاتے ہیں ۔‘‘ میں نے کہا مگر دادی اماں مجھے تو انہوں نے کبھی پیار نہیں کیا ۔ نہ گود میں بٹھایا ۔ دادی اماں بولیں ، بیٹے تم کو یاد نہیں ہے تم جب سو جاتے ہو تو روزانہ اللہ میاں تمھارے پاس آتے ہیں اور پیار کر کے مٹھائی بھی دے جاتے ہیں ۔ میں نے کہا پھر چلے کیوں جاتے ہیں ۔ کہنے لگیں انہیں بہت زیادہ کام ہوتا ہے نا اس لئے ۔ انہی کی دی ہوئی مٹھائی تو میں تم کو دیتی ہوں ۔ اتنے سارے بچوں کے پاس ان کو جانا ہوتا ہے نا اس لئے جلدی چلے جاتے ہیں ۔

دوسرے دن میں نے سونے سے صاف انکار کر دیا کہ میں نے اللہ میاں کو دیکھنا ہے ۔ میں

مسلسل سوال کئے جاتا مگر مجال ہے جو دادی اماں کی پیشانی پر بل بھی آیا ہو۔ وہ مسکرا مسکرا کے جواب دیئے جاتیں۔ اسی دوران میرے سونے کا ٹائم بھی نکل گیا۔ مگر انہوں نے ایک بار بھی میرے سونے پر اصرار نہ کیا۔ اب میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں میں نے دادی اماں کی آغوش میں منہ چھپالیا۔ دادی اماں مجھے نیند آرہی ہے۔ اللہ میاں کب آئیں گے؟ دادی اماں تھپکتے ہوئے بولیں، کوئی بات نہیں ہے بیٹے تم سو جاؤ گے تو تمھارے خواب میں آئیں گے۔ اس وقت میری عمر تقریباً چار سال کی تھی۔ مجھے دادی اماں ایک ایک بات پر پکا یقین تھا۔ اسی یقین کے ساتھ میری پلکیں بوجھل ہو گئیں۔ دادی اماں نے مجھے اپنی آغوش میں اچھی طرح سمیٹ لیا اور اپنی چادر سے ڈھانپ لیا۔ اس رات دادی اماں نے مجھے اپنے ساتھ سلالیا۔

صبح میں سو کر اُٹھا تو دادی اماں کے جسم کے گرم گرم لمس نے میرے اندر خوشیوں کے فوارے بھر دیئے۔ میں نے خوشی خوشی ان کے سینے سے چمٹے ہوئے کہا۔ دادی اماں پتہ ہے رات اللہ میاں آئے تھے۔ وہ بولیں، اچھا۔ اللہ میاں کیسے تھے؟ میں نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا بالکل آپ جیسے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چمٹایا اور خوب پیار کیا۔ پھر اپنی چادر میں مجھ کو چھپا کر اپنے ہاتھ سے مٹھائی کھلائی۔ سچ مچ دادی اماں وہ بالکل آپ جیسے تھے۔ وہ میری نادان باتوں پر ذرا بھی خفا نہ ہوئیں۔ بلکہ پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔ میں نے کہا اگر بچوں کو کسی سے محبت نہ ہو تو کیا پھر اللہ میاں نظر نہیں آتے؟ وہ بولیں، بیٹے اللہ میاں کا تو نام ہی محبت ہے۔ محبت ہی نہیں ہوگی تو اللہ میاں بھی نظر نہیں آئیں گے۔

اب میرے ذہن میں یہ بات نقش ہوگئی کہ اللہ میاں کو دیکھنے کے لئے محبت کرنا ضروری ہے۔ مگر سچ بات تو یہ ہے کہ ان دنوں مجھے دادی اماں اللہ میاں سے بھی پیاری لگتی تھیں۔ وہ مجھے اپنے نرم و گداز جسم سے چمٹا کر محبت کی گرمی سے بھرپور بوسے دیتیں۔ میری ہر ضرورت کا خیال رکھتیں۔ مجھے میری دل پسند کہانیاں سناتیں۔ اللہ میاں کو تو میں صرف دادی اماں کے توسط سے جانتا تھا۔ جس طرح دادی اماں کہتیں کہ اللہ میاں ایسے ہیں ویسے ہیں۔ بس اسی طرح مجھے خواب میں اللہ میاں دکھائی دے جاتے یا پھر تصور میں دادی اماں کی بیان کردہ صورت آجاتی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں دادی اماں اللہ میاں کی جو بھی صفت بیان کرتیں وہ ساری کی ساری مجھے دادی اماں میں نظر آجاتی۔ میرا ننھا سا ذہن اللہ میاں کو دادی کے وجود میں دیکھا کرتا۔ جیسے جیسے عقل و سمجھ بڑھتی گئی دادی کی محبت بھی بڑھتی گئی اور

دادی کے ساتھ ساتھ اللہ میاں سے بھی پیار بڑھتا رہا ۔ کیونکہ دادی اماں اکثر و بیشتر اللہ میاں کی بڑی پیاری پیاری کہانیاں سنایا کرتیں ۔ ایک کہانی تو مجھے اتنی پسند تھی کہ میں نے فرمائش کر کے اسے بچپن میں کئی مرتبہ سنا ۔ وہ کہانی میرا دل اب بھی دہراتا رہتا ہے ۔

وہ بڑے پیار سے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے کہتیں ۔

ایک بڑی سی حویلی تھی ۔ خوب بڑی ۔ میں جھٹ کہتا ۔ ہمارے گھر جیسی ؟ دادی اماں ۔ کہتیں ہاں بالکل ہمارے گھر جیسی ۔ اس میں ایک چاند سا لڑکا رہتا تھا ۔ میں بے ساختہ کہہ اُٹھتا میرے جیسا دادی اماں ؟ بالکل تمہارے جیسا بیٹے ۔ اس کے ماں باپ اس بچے سے بہت پیار کرتے تھے مگر سب سے زیادہ پیار بچے کی دادی اس بچے سے کرتی تھی ۔ میں پھر بول پڑتا جیسے آپ مجھ سے کرتی ہیں دادی اماں ؟ بالکل اسی طرح بیٹے ۔ پھر وہ گہرے گہرے لہجے میں کہتیں ۔ پیار کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے بیٹے ۔ میں کہتا پیار کا بھی رنگ ہوتا ہے ؟ وہ کہتیں ، ہاں ! پیار کا بھی رنگ ہوتا ہے ۔ وہ لڑکا دادی اماں کے پیار کے رنگ میں رنگ گیا ۔ ایک دن اس لڑکے نے اپنی دادی سے پوچھا ۔ دادی اماں آپ نے پیار کا رنگ کہاں دیکھا ؟ دادی اماں نے کہا ۔ دور آسمان کے کنارے پر ایک دریا ہے ۔ اس دریا میں پیار کا رنگ بہتا ہے ۔ یہ دریا اللہ میاں کی محبت کا دریا ہے ۔ اس دریا میں جو بھی نہا لیتا ہے ۔ وہ رنگین ہو جاتا ہے ۔ جیسے تمہاری امی دوپٹہ رنگتی ہیں نا ۔ رنگین پانی میں سفید دوپٹہ ڈال دو تو دوپٹہ پانی کے رنگ کا ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح اللہ میاں کی محبت کے دریا میں بھی جب کوئی نہا لیتا ہے تو وہ بھی رنگین ہو جاتا ہے ۔

یہ سن کر لڑکے کو شوق ہوا ۔ وہ اپنی دادی سے ضد کرنے لگا کہ میں بھی دریا میں نہاؤں گا ۔ آخر ایک دن اس کی دادی نے اس کی بات مان ہی لی ۔ اس کو خوب نہلا دھلا کر اچھے اچھے کپڑے پہنائے ، کنگھی کی ، پھر ہاتھ پکڑ کر کوٹھے پر سب سے اونچے کمرے میں لے گئی ۔ یہ کمرہ دادی اماں کی عبادت گاہ تھا ۔ یہاں وہ عبادت کرتی تھیں ۔ کمرہ بالکل خالی تھا اس کی دیواروں پر سفید چاندنی بچھی تھی اور ایک جانب خوبصورت پھولوں کا گلدستہ رکھا تھا ۔ دادی اماں نے کمرے میں پہنچ کر لڑکے سے کہا ۔ فرش پر بیٹھ جاؤ ، پھر خود بھی بچے کے پاس بیٹھ گئیں ۔ بچے سے کہا ۔ اب ہم آسمان کے کنارے اللہ میاں کی محبت کے دریا میں نہانے جا رہے ہیں ۔ تم آنکھیں بند کر لو پھر خود بھی آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ کہنے لگیں ہم دونوں چڑیا کی طرح ہلکے پھلکے ہیں ۔ ہم چڑیا کی طرح اڑ رہے ہیں ۔ ہم زمین سے بہت دور آسمان کی طرف جا رہے ہیں ۔ وہ دیکھو محبت کا دریا بہہ رہا ہے ۔ میرا ہاتھ پکڑو ۔ اب ہم اس میں نہا رہے ہیں ۔

ارے تم تو بالکل رنگین ہو گئے ۔ دادی اماں آپ بھی تو رنگ گئی ہیں ۔ بند آنکھوں سے وہ لڑکا اس دریا کو دیکھتا ۔ اس میں اپنی دادی کے ساتھ نہاتا ۔

ایک مرتبہ لڑکا جب دریا سے نہا کر نکلا تو کنارے پر اسے ایک آدمی دکھائی دیا ۔ یہ ایک بزرگ آدمی تھے انہوں نے لڑکے سے کہا ۔ روزانہ تم اپنی دادی کے ساتھ نہاتے ہو آج ہم تم کو اس دریا کی سیر کراتے ہیں ۔ تم نے دریا کی گہرائی میں تو دیکھا ہی نہیں ۔ لڑکا یہ سن کر ڈر گیا ۔ اس نے سوچا پہلے مجھے اپنی دادی سے اجازت لینی چاہیئے جو مجھے یہاں تک لائی ہیں ۔ اس نے دادی سے پوچھا ۔ دادی میں اس آدمی کے ساتھ دریا میں چلا جاؤں ۔ دادی نے کہا ۔ اب تم اس آدمی کے ساتھ ہی دریا کی سیر کیا کرو ۔ یہ سنتے ہی لڑکا ان بزرگ کے ساتھ چل پڑا ۔ دونوں تھوڑی دیر تک پانی پر چلتے رہے پھر پانی کے اندر ایک سیڑھی ظاہر ہوئی اور اس سیڑھی سے پانی کے اندر اتر گئے ۔ پانی کے اندر کی تہہ میں ایک بہت بڑا محل تھا ۔ وہ بزرگ اس محل کے اندر اس لڑکے کو لے گئے ۔ کہنے لگے ، یہ محل اللہ میاں کا محل ہے ۔ اس محل کے اندر سے بہت سے رنگوں کے دریا نکلتے ہیں ۔ چونکہ تمہیں اللہ میاں کے رنگین دریا دیکھنے کا بہت شوق ہے اس لئے ہم تم کو یہاں لائے ہیں ۔ یہاں صرف وہ لوگ آتے ہیں ۔ جن کو دیکھنے کا شوق ہوتا ہے ۔ لڑکے نے نہایت اشتیاق سے کہا ۔ اے مہربان بزرگ مجھے اللہ میاں کے رنگوں کے دریا دیکھنے کا بے حد شوق ہے ۔ کیا میں دیکھ سکتا ہوں ۔ بزرگ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لے گئے ۔ دونوں محل کے اندر اندر چلتے رہے ۔ یہ محل بہت ہی بڑا تھا ۔ اس میں بے شمار کمرے تھے ۔ تمام کمرے بند تھے ۔ ہر کمرے میں بڑی بڑی شیشوں والی کھڑکیاں تھیں ۔ مگر شیشے دھندلائے ہوئے تھے ۔

جیسے بہت دنوں سے یہاں کوئی نہیں آیا تھا ۔ لڑکا چلتے چلتے ان شیشوں سے دیکھتا جاتا ۔ اس کے اندر اسے بڑی عجیب وغریب چیزیں دکھائی دیتیں کئی چیزیں تو اسے اتنی اچھی لگتیں کہ اس کا جی چاہتا کہ وہ ٹھہر جائے مگر بزرگ اس کا ہاتھ تھامے بہت تیزی سے گزرتے رہے ۔ اب وہ ایک صحن میں پہنچ چکے تھے ۔ اس صحن کی لمبائی چوڑائی پورے آسمان جتنی تھی ۔ بہت بڑی ۔ اس صحن میں زمین سے ہر رنگ کے چشمے پھوٹ رہے تھے ۔ ان چشموں سے پانی کے ساتھ ساتھ روشنی بھی نکلتی محسوس ہوتی تھی ۔ رنگین روشنیاں سارے صحن میں پھیل کر بہت خوبصورت رنگین ہیولے بنا رہی تھیں ۔

بزرگ نے لڑکے سے کہا ۔ کیا تم بھی ان ہیولوں کی طرح روشن بننا چاہتے ہو ۔ لڑکے نے خوش ہو کر کہا ۔ میں بھی ان جیسا بننا چاہتا ہوں ۔ بزرگ نے اس لڑکے کو اوپر دریا میں غوطا دیا ۔ جب وہ لڑکا

پانی سے باہر آتا تو انہیں رنگین روشن ہیولوں کی طرح بن جاتا ۔ جب دوسرے رنگ میں نہاتا تو پہلا رنگ نئے رنگ میں چھپ جاتا ۔ جب لڑکا سارے رنگوں میں نہا گیا تو باہر نکلا ۔ اب اس کا سارا جسم سارا لباس بالکل سفید چاندی کی طرح ہو گیا تھا ۔ اس کے جسم سے سفید روشنیاں پھوٹ رہی تھیں ۔ اس نے چاروں طرف دیکھا ۔ سارا صحن سارا آسمان اس کی روشنی سے سفید ہو رہا تھا ۔ اس نے اپنے جسم کو ہاتھ لگایا ۔ یہ جسم چاندی کی طرح خوب مضبوط لگتا تھا ۔ مگر اس میں چاندی کی سی سختی نہ تھی بلکہ چاندی کی طرح نرمی اور لطافت تھی ۔ بزرگ نے اس سے کہا ۔ یہ جسم سب سے اچھا جسم ہے ۔ اس جسم کے ساتھ تم کبھی بیمار نہیں ہو گے اس جسم کے ساتھ تم دریا کے اندر تہہ میں بھی جا سکتے ہو اور آسمان کی بلندیوں پر بھی اڑ سکتے ہو ۔ جاؤ اور زمین اور آسمان کی سیر کرو ۔ چونکہ تم اللہ سے محبت کرتے ہو اس وجہ سے اللہ نے یہ جسم تمہاری محبت کے صلے میں تمہیں انعام میں دیا ہے ۔ اس جسم کے ساتھ تم زمین اور آسمان میں بسنے والی اللہ کی مخلوق سے محبت کرو گے اور ساری مخلوق بھی تم سے محبت کرے گی ۔ اب تم اپنی دادی کے پاس جاؤ ۔ یہ سب کچھ آہستہ آہستہ ہو گا ۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے ۔ لڑکے نے آنکھیں کھولیں ۔ اپنی دادی کو ساری کہانی سنائی کہ کس طرح وہ بزرگ اسے دریاؤں میں لے کر گئے ۔ اس کی دادی یہ سن کر بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں بیٹے بڑوں کا ادب، ان کی فرمانبرداری اور بڑوں اور چھوٹوں سے محبت کرنے سے اللہ میاں سب سے زیادہ خوش ہوتے ہیں اور اچھے اچھے انعام دیتے ہیں ۔ جن سے بندہ ہمیشہ فائدہ اٹھاتا ہے ۔

دادی اماں کی یہ کہانی جب بھی میں سنتا مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کہانی کا ہر کردار زندہ ہے ۔ وہ لڑکا میں ہوں ۔ وہ دادی میری دادی اماں ہیں ۔ مگر وہ بزرگ کون ہیں، کہاں ہیں، میرا ذہن اکثر کہانی کے اس کردار کی تلاش میں تصور میں کھو جاتا ۔ میں سوچتا، دادی اماں کی کوئی بات جھوٹی کیسے ہو سکتی ہے ۔ یہ بزرگ بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہوں گے ۔ جب دادی اماں کی مرضی ہو گی یہ بزرگ بھی مجھے مل جائیں گے ۔ ان دنوں میں اسکول کی چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا ۔ برسات کے دن تھے ۔ دادی اماں سخت بیمار ہو گئیں ۔ جانے انہیں کیا ہو گیا تھا ۔ ان کا بخار ٹوٹتا ہی نہ تھا ۔ سارا گھر ان کی بیماری سے پریشان ہو گیا ۔ امی کا چہکنا بند ہو گیا ۔ میری بہنیں دبے پاؤں گھر میں اس طرح چلتیں جیسے ان کے چلنے سے فرش ٹوٹ جائے گا ۔ دادی اماں بخار میں نیم بے ہوش پڑی رہتیں ۔ روزانہ ڈاکٹر آکر انجکشن اور دوائی دیتا ۔ میں ہر وقت چوری چوری اور دور سے دادی اماں کو دیکھتا ۔ ان کے پاس جانے کی مجھ میں

ہمت نہ ہوتی ۔ مجھے لگتا اگر میں ان کے پاس گیا تو میرا دل غم سے پھٹ جائے گا۔کبھی میں نماز پڑھ کر اللہ سے دعا کرتا۔کبھی آنکھیں بند کر کے اللہ میاں سے کہانی کے لڑکے کی طرح درخواست والتجا کرتا۔مگر دل میں ایک اُمید تھی کہ دادی اماں جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ ساتویں دن مغرب کے وقت میری امی پریشانی کے عالم میں میرے پاس آئیں ۔میرا ہاتھ پکڑا اور گھبرا کے بولیں ،سلمان جلدی آؤ دادی اماں تم کو بُلا رہی ہیں ۔ میں تیر کی طرح دوڑ کر پہنچا۔ دادی اماں کے گال بالکل سرخ ہو رہے تھے۔ان کی آنکھوں میں بھی سرخی تھی ۔ میں نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا ان کے پاس بیٹھ گیا اور آہستہ سے کہا۔دادی اماں آپ نے مجھے بلایا ہے۔انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں ان کے چہرے کے بالکل قریب ہو گیا۔وہ بولیں ،سلمان بیٹے وہ کہانی یاد ہے تمہیں ۔دریا میں نہانے والی ، میں نے کہا، ہاں ۔دادی اماں بولیں ، میں اب دریا میں ڈوبنے جا رہی ہوں ۔میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ۔دادی اماں آپ کے گال اور آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں ۔انہوں نے ایک گہرا سانس لیا، بولیں ۔بیٹے کہانی کے لڑکے کی طرح بننا۔سب سے محبت کرنا تا کہ اللہ تمہیں اپنا انعام عطا کر دیں ۔اتنا کہنے کے بعد انہوں نے مجھے چوما اور اسی وقت ان کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں ۔ان پر غشی طاری ہو گئی۔ میں گھبرا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ڈاکٹر کو فون کیا گیا مگر ان کے آنے سے پہلے ہی دادی اماں نے دریا میں غوطہ لگا دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اللہ میاں نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔

دادی اماں کے بغیر بہت دن تک مجھے اپنی ذات بھی ادھوری لگی ۔ میں روز رات کو ان کی قبر پر لیٹ کر خوب روتا ۔میری ہچکیاں سن کر کبھی پاپا کبھی چچی مجھے بہلاتے ۔کبھی کبھی تو وہ خود بھی میرے ساتھ ساتھ رونے لگ جاتے ۔ دادی کے بغیر سارا گھر ویران ہو گیا تھا۔ایک ڈیڑھ ماہ تک دل کی حالت آہستہ آہستہ سنبھل گئی ۔اب اکثر میرے دل میں خیال آتا کہ اگر کسی سے بہت محبت ہو تو محبت چونکہ اللہ کا دریا (صفت) ہے اس وجہ سے محبت تو اللہ کا نور ہے اور وہ شخص ایک خالی بالٹی کی طرح ہے ۔پس وہ شخص جو بالٹی کی طرح ایک صورت انسانی ہے اور اس کے اندر اللہ کی محبت ،اللہ کا نور ہے ۔اب میں سوچتا ہوں یہ نور مجھے کیسے ملے گا۔اسی دوران ہمارے محلے میں ایک نئے پڑوسی آئے جو گلی کے دوسرے سرے پر رہتے تھے ۔ان کا ایک لڑکا سلیم میرا ہم عمر تھا۔اس نے میری ہی کلاس میں داخلہ لیا ۔اس طرح اس سے دوستی ہو گئی ۔ یہ دوستی اتنی بڑھی کہ ہمارا زیادہ تر وقت اکٹھا گزرنے لگا۔ہم اکٹھا اسکول آتے جاتے اور شام کو بھی اکٹھا کھیلتے ۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ میری عمر اس وقت چودہ سال کی تھی۔ میرے ذہن میں اکثر یہ خیال آتا۔ اللہ نے مجھے کیوں پیدا کیا ہے۔ میں اس دنیا میں آنے سے پہلے کہاں تھا، میں کیا ہوں؟ اللہ کے ساتھ میرا کیا رشتہ ہے۔ جب بھی اس قسم کے خیالات آتے میرا ذہن ان خیالات سے جیسے چپک کر رہ جاتا۔ میں گھنٹوں سوچتا کہ اللہ کہاں ہے۔ اسے کہاں ڈھونڈنا چاہیئے۔ انہیں خیالات نے میرے اندر قرآن مجید کو باترجمہ پڑھنے کا شوق پیدا کر دیا۔ میں روزانہ قرآن کو ترجمہ سے پڑھنے لگا۔ مگر یہ مجھے صرف ایک نصیحت کی کتاب لگی۔ میرا دل کہتا، ان الفاظ کی گہرائی میں تمہیں تمہارے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔ مگر مجھے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ قرآن کے الفاظ کی گہرائی میں کس طرح دیکھا جاتا ہے۔

انہی دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جب اسکول جانے کے لئے صبح میں اپنے دوست کو لینے اس کے گھر گیا تو یہ دیکھ کہ ہم دونوں حیران رہ گئے کہ جس رنگ کے کپڑے میں نے پہن رکھے تھے اسی رنگ کے کپڑے اس نے بھی پہنے تھے۔ ان دنوں اسکول میں یونیفارم نہیں تھا۔ سب اپنی مرضی کے کپڑے پہن کر آتے تھے۔ ہم نے اسے اتفاق سمجھ کر جلد ہی اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ تیسرے دن پھر ایسا ہی ہوا کہ جس رنگ کی میری پینٹ تھی اسی رنگ کی پینٹ اس نے بھی پہن رکھی تھی۔

اسی کے دو دن بعد پھر ایسا ہی ہوا اس دن تو کلاس کا ہر فرد یہی سمجھ رہا تھا کہ ہم آپس میں صلاح کر کے کپڑے پہنتے ہیں۔ جب ہم دونوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہے ہم کپڑوں کا ذکر بھی نہیں کرتے تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ سب یہی کہتے رہے کہ کیا تم نے ہمیں اتنا بیوقوف سمجھ رکھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ سلیم کا اس واقعے سے متعلق کیا خیال تھا۔ کیونکہ اس کے اندر میں نے تجسس نہیں پایا۔ اس نے دوبارہ اس کا ذکر بھی نہیں کیا مگر میرے ذہن میں یہ خیال اٹک کر رہ گیا کہ تین مرتبہ مسلسل ایک ہی بات کی تکرار اتفاق نہیں ہو سکتی۔ اسی خیال میں شام ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ چلو سلیم سے کہہ دوں کہ آج میں کھیلنے نہیں آؤں گا۔ ابھی آدھا راستہ طے کیا تھا کہ سلیم آتا دکھائی دیا۔ میں نے دور سے ہی چلا کر کہا۔ یار آج میں کھیلنے نہیں آؤں گا۔ وہ فوراً بول پڑا، میں بھی تم سے یہی کہنے آ رہا تھا کہ آج میں نہیں کھیلوں گا۔ پھر بولا "یار تُو تو میرے خیال کو پڑھنے لگا ہے شاید"۔ میرے اندر ایک سنسنی سی دوڑ گئی، مگر میں ہنس کر واپس دوڑ آیا تو دادی اماں کی تصویر پر نظر پڑی۔ مجھے بچپن کی وہ آواز سنائی دی۔ اللہ میاں کے دریا میں جو بچے نہاتے ہیں تو ان کا رنگ بھی دریا کے رنگ جیسا ہو جاتا ہے۔ خیال آیا کیا سلیم اور میں دونوں ایک ہی دریا میں نہا چکے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا مجھے سلیم سے بے انتہا محبت ہے۔ جیسی دادی اماں سے تھی۔ سلیم کو ایک دن نہ

دیکھوں تو طبیعت میں چڑ چڑاہٹ آنے لگتی ہے۔اس کے بغیر زندگی خالی خالی لگتی ہے۔جی چاہتا ہے اپنی ہر اچھی چیز سلیم کو دے دوں۔جذبہٴ محبت ایک ہی ہے مگر عمر کے ساتھ ساتھ اس کے اظہار میں فرق آگیا ہے۔

دادی اماں سے محبت کا اظہار اس کی آغوش میں چھپ کر ہوتا تھا اور دوست سے محبت کا اظہار اس کے ساتھ کھیل کر ہوتا ہے۔وہاں محبت بھری معصوم باتیں تھیں اور یہاں اسکول کی باتیں، پڑھائی کی باتیں، یار دوستوں کی باتیں ہیں۔مگر انہی باتوں کے ساتھ ساتھ محبت ہمیں اپنے رنگ میں رنگتی رہی۔ یہاں تک کہ ہمارے کپڑے ایک ہی رنگ کے ہوگئے۔میرے دل میں ایک انجانی سی خوشی پھوٹنے لگی، ذہن کا تجسس دور ہوگیا تھا۔اسی طرح ایک سال اور گزر گیا اس دوران کتنی ہی بار ایسا ہوا کہ جو بات میں منہ سے نکالتا سلیم ایک دم چونک کر کہتا ارے میں ابھی تم سے یہی کہنے والا تھا۔جب بھی یہ واقعہ رونما ہوتا میرے کانوں میں دادی اماں کی آواز گونج جاتی۔''بیٹا جب بندہ اللہ تعالیٰ کے دریا میں نہاتا ہے تو اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔'' میں سوچتا میرے اندر کی ہر صلاحیت اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے اور میرا جی چاہتا، یہ صلاحیتیں اور بڑھ جائیں۔ مجھے معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی کون کون سی صفات میرے اندر کام کر رہی ہے۔روز افزوں اللہ تعالیٰ کو جاننے کا شوق میرے اندر زور پکڑتا گیا۔مجھے اللہ میاں اب دادی اماں اور سلیم دونوں سے بھی زیادہ اچھے لگنے لگے۔

میرا اور سلیم کا اسکول میں آخری سال تھا۔ہم دونوں بڑی توجہ کے ساتھ امتحان کی تیاری میں مصروف ہوگئے اس دوران ذہن زیادہ تر پڑھائی کی طرف متوجہ رہتا۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ممی اور پاپا کی جانب سے بڑی کڑی نگرانی تھی۔وقت پر پڑھو، وقت پر سوؤ، کھیلنے کے اوقات چوبیس گھنٹے میں صرف آدھ گھنٹے رہ گئے تھے۔ویسے بھی امتحان سر پر سوار ہو تو کھیل سے دلچسپی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔اللہ اللہ کر کے یہ دن بھی ختم ہوئے۔امتحان بخیر وخوبی کے ساتھ انجام پائے۔اب رزلٹ کی فکر تھی اور مجھ سے زیادہ ممی پاپا کو میرے پاس ہونے کی فکر تھی۔ممی بڑی لاڈ سے کہتیں میرا بیٹا انشاء اللہ فرسٹ ڈویژن لائے گا۔پھر میں اسے کمپیوٹر میں داخلہ دلواؤں گی۔میں سوچتا ماں باپ کو اولاد کی کتنی فکر ہوتی ہے۔کیا اللہ کو بھی میری اتنی ہی فکر ہے پھر دادی کی بات یاد آجاتی۔ ''بیٹا اللہ تو ہے ہی محبت''۔اس خیال کے ساتھ ہی دل میں ٹھنڈک سی محسوس ہوتی۔اللہ پاک میرے ممی پاپا سے بھی تو محبت کرتے ہیں پھر ان کی توقعات کو کیسے ضائع کردیں گے۔

امتحان ختم ہونے کے دوسرے دن ہی راولپنڈی سے سیماں پھپھو کا فون آیا۔ پھپھو کا پُر جوش اصرار تھا کہ تمام بچوں کو فوراً راولپنڈی بھیج دیا جائے۔ ہم سب کے لئے تو یہ بڑی خوشخبری تھی۔ ایک دن میں تیاری مکمل کی۔ پاپا ایک دن ہم چاروں کی ایئر ٹکٹ لے آئے اور سمیرا باجی، ثمینہ، راحیلہ اور میں راولپنڈی کے لئے روانہ ہو گئے۔ ایئر پورٹ پر سارا گھر ہی ہمیں لینے آیا ہوا تھا۔ وقاص بھائی اور رزیما سے مل کر سب بہت خوش ہوئے کیونکہ سارے ہی ہم عمر تھے۔ وقاص بھائی مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے تھے اور رزیما مجھ سے تقریباً آٹھ ماہ چھوٹی تھی۔ مگر راولپنڈی کی صحتمندانہ آب و ہوا نے دونوں پر خوشگوار اثرات چھوڑے تھے۔ رزیما قد میں سمیرا باجی سے بھی کچھ لمبی تھی۔ وہ دن زندگی کے بڑے ہی حسین دن تھے۔ تقریباً روز ہی عتیق پھوپھا ہمارے لئے کہیں نہ کہیں کا پروگرام بنا دیتے۔ کبھی تو ہم سب بہن بھائی مل کر اکیلے چلے جاتے اور کبھی وہ خود شامل ہو جاتے۔ پھر انہوں نے آزاد کشمیر جانے کے لئے ایک ہفتے کی دفتر سے چھٹی لے لی۔

آزاد کشمیر میں ان کے دوست رہتے تھے۔ پروگرام یہ بنا کہ ان کے گھر ٹھہرا جائے پھر وہاں سے پہاڑیوں کی سیر کی جائے۔ ہم سب بڑی سی وین میں کشمیر کے لئے روانہ ہوئے۔ جوں جوں آگے بڑھتے جاتے راستہ اور زیادہ خوبصورت ہوتا جاتا۔ ہرے بھرے بلند پہاڑ جن پر خود بخود دل کے جذبات نغموں میں ڈھل گئے۔ خوبصورت نغموں اور قہقہوں سے بھرپور سفر آج بھی حافظے پر نقش ہے۔ ہم نے آزاد کشمیر کی پہاڑیوں میں دور دور تک سیر کی۔ جانے کیا بات تھی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر مجھے یوں لگتا جیسے اللہ میاں یہیں آس پاس ہیں۔ نگاہیں خلاؤں میں کھو جاتیں اور میں لڑکیوں کے مذاق کا ہدف بن جاتا۔ میرا جی چاہتا کوئی مجھے یہاں اکیلا چھوڑ دے اور میں پہاڑوں کے درمیاں وادی میں اُڑتا پھروں، اُڑ کر ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ پر جاؤں میرا دل چاہتا کہ میں اللہ میاں کے اس دریا میں غوطہ لگا دوں جوان پہاڑوں پر بہہ رہا ہے۔ مگر نہ ہی اپنا دل میں کسی اور کو دکھا سکتا تھا اور خود مجھے اس کشش کی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ بس ایک بے اختیار جذبہ تھا۔ ایک حظّ نا طیسیت تھی جو پہاڑ کی چوٹی پر ٹھہرنے پر اکساتی تھی۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا کہ آئندہ زندگی میں کبھی نہ کبھی جب بھی موقع ملا کچھ دن پہاڑ پر ضرور گزاروں گا مگر تنہا، تا کہ ان بلند و بالا پہاڑوں کی کشش کو پوری طرح اپنے اندر سمو لوں۔

دور تصور کے آسمان پر دادی اماں کا چہرہ چمکا اور مجھے یوں لگا جیسے یہ کشش ہی وہ دریا ہے جو

پہاڑوں کی چوٹیوں پر بہہ رہا ہے۔میرا دل اندر ہی اندر مخاطب ہوا۔اے دریا مجھے بھولنا مت۔میں پھر آؤں گا،تمہارے پانیوں سے کھیلوں گا۔تمہارے رنگ میں اپنا دامن رنگ لوں گا۔اس عہدو پیمان نے میرے اندر کی تڑپ کم کردی اور میں اطمینان سے باقی افراد کے ساتھ سیر وتفریح میں مگن ہوگیا۔

چند روز بعد ہم کراچی لوٹ آئے۔رزلٹ نکلنے والا تھا۔مجھے اپنے پاس ہونے کی پوری اُمید تھی اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں اپنی خوشیاں می پاپا کے ساتھ شیئر کروں۔تیسرے دن رزلٹ تھا۔رات گیارہ،بارہ بجے تک ہم سب بیٹھے اسی کے متعلق باتیں کرتے رہے کہ فلاں کالج میں ایڈمشن لینا ہے۔فلاں کالج سب سے اچھا ہے۔بستر پر لیٹا تو خیالات کی ایک فلم چلتی رہی۔دادی اماں بھی بہت یاد آئیں۔بالآخر آنکھ لگ گئی مگر اذان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا اور نماز کے بعد اللہ کے حضور سچے دل سے اپنے پاس ہونے کی درخواست دی۔انتظار بے چینی کا نام ہے۔نماز کے بعد مجھ سے کمرے میں بیٹھا نہ گیا۔باہر نکلا تو صحن میں می کو ٹہلتا پایا۔مجھے دیکھ کر گلے سے لگا لیا اور ہنس کر بولیں۔آج تمہارا رزلٹ ہے نا۔میرا دل نماز میں بھی نہیں لگ رہا۔جلدی پڑھ کے باہر نکل آئی ہوں۔عجیب بے چینی ہو رہی ہے۔جلدی سے اخبار آئے تو سکون ملے۔ہم دونوں صحن میں تخت پر بیٹھ گئے۔میں نے می کے زانوں پر سر رکھ دیا۔آج میں خود کو بڑا کمزور محسوس کر رہا تھا مگر ممتا میرے جذبات سے واقف تھی۔می میرے بالوں کو پیار سے سہلانے لگیں اور آہستہ آہستہ میری بے چینی کچھ کم ہونے لگی۔تھوڑی دیر میں پاپا بھی آ گئے اور اسی وقت اخبار والے نے اخبار پھینکا۔میں تیر کی طرح لپک کر اٹھانے دوڑا۔میرا نام فرسٹ ڈویژن کی لسٹ میں تھا۔سارے گھر میں شور مچ گیا۔پاپا اور می نے خوب پیار کیا۔سلیم بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوگیا تھا۔میں بھاگا بھاگا اس کے گھر پہنچا۔ہم دونوں خوب گلے ملے۔یوں لگتا تھا جیسے زندگی صرف خوشی کا نام ہے۔

چند روز بعد میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔سلیم نے ایک دوسرے کالج میں داخلہ لیا۔کمپیوٹر میری پسندیدہ چیز تھی ایک بار پھر ہم دونوں پڑھائی میں لگ گئے۔مگر جانے کیا بات تھی کہ پہاڑوں سے آ کر اب بھی کبھی کبھی طبیعت میں ایک عجیب سی بے چینی و اضطراب سا محسوس ہوتا جیسے پہاڑوں کی حفنا طیسیت مجھے کھینچ رہی ہے۔میں اپنے آپ کو کسی خوبصورت پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا دیکھتا۔یوں لگتا جیسے کوئی میرے انتظار میں ہے۔ایسے میں میرا دل اللہ کی طرف مائل ہو جاتا اور قرآن کا ترجمہ پڑھ کر اس میں غور وفکر کیا کرتا۔میرا زیادہ وقت کمپیوٹر کے ساتھ اور قرآن میں غور وفکر کے ساتھ گزرنے لگا۔

اب سلیم سے بھی ملاقات کم ہی ہوتی تھی ۔وہ بھی مصروف ہو گیا تھا ۔پھر بھی زندگی مزے میں گزر رہی تھی ۔تین سال اسی طرح گزر گئے ۔پڑھائی کے ساتھ ساتھ قرآن کے ترجمہ پر غور وفکر کرنا میری عادت بن گئی ۔کمپیوٹر کی مشین سے اکثر میں دماغ کا موازنہ کرتا اور اللہ تعالٰی کے کمپیوٹر یعنی دماغ کے کمالات کھلتے چلے جاتے ۔میں سوچتا جس خالق نے دماغ جیسی مشین بنائی ہے خود اس کا دماغ کیسا ہو گا ۔اس وقت میرا یہ خیال گہرائی میں ڈوبتا محسوس ہوتا ۔یہاں تک کہ ایک تحیر مجھ پر طاری ہو جاتا ۔میرا دل کہتا تم اس کمپیوٹر سے اصل کمپیوٹر کی جانب بڑھو ۔اس کا علم حاصل کرو ۔یہ دیکھو کہ اس کی پروگرامنگ کہاں سے ہو رہی ہے ۔اسکرین پر تو وہی ڈسپلے ہوتا ہے جس کی پروگرامنگ کی جاتی ہے ۔خیالات پروگرامنگ ہیں اور اعمال اس پروگرامنگ کا ڈسپلے ہیں ۔ڈسپلے کے لئے اسکرین کا ہونا ضروری ہے ۔پس اسکرین شعور اور جسم ہے ۔اسکرین غلطیوں کا ذمہ دار کیسے ہوا ۔کیا کمپیوٹر خود اپنی پروگرامنگ کر رہا ہے ۔اللہ کا انسانی شعور سے کیا رشتہ ہے ۔ایسے ہی خیالات رات دن میرے دماغ کو گھیرے رہتے اور میں قرآن لے کر بیٹھ جاتا اور اس کے اندر اپنے سوالوں کا جواب ڈھونڈا کرتا ۔

میرا دل کہتا، قرآن میں اللہ کے اسرار و رموز موجود ہیں ۔انہیں ڈھونڈنے کی ضرورت ہے ۔دن بدن میرا انہماک قرآن کی حکمتوں کو جاننے میں بڑھتا چلا گیا ۔ایک رات میں قرآن پڑھ کر اس کی آیتوں میں غور کر رہا تھا کہ ثمینہ نے سلیم کے آنے کی اطلاع دی ۔اس وقت مجھے سلیم کا آنا کچھ ناگوار گزرا ۔میں خود اپنی طبیعت کی تبدیلی پر حیران رہ گیا ۔کوئی اور وقت ہوتا تو میں دوڑ کر جاتا ۔میں سوچنے لگا ۔دوست کی ذات میں میرا انہماک تبدیل ہو کر اب قرآن کے علوم جاننے سے وابستہ ہو گیا ہے ۔میں نے سوچا، ذہن کی مرکزیتیں بدلتی ہیں ۔ذہن کی مرکزیت جس کے ساتھ قائم ہو وہی شئے دل سے قریب ہو جاتی ہے ۔انسان ہر دم علم حاصل کر رہا ہے ۔میرا جی چاہا کسی ایسی ہستی کو ذہن کی مرکزیت بنا لوں جو مجھے قرآن کے اسرار سے آگاہ کر دے ۔

دن نہایت تیزی سے گزرتے رہے ۔کالج میں یہ میرا آخری سال تھا ۔میں پوری تندہی کے ساتھ پڑھائی میں مصروف ہو گیا ۔پڑھائی کا اتنا بوجھ تھا کہ کتنے دن قرآن کھولنے کی نوبت نہ آتی تھی مگر علوم الٰہی سیکھنے کا تقاضہ اب بھی دل کی گہرائی میں موجود تھا ۔سوچتا تھا کہ پڑھائی سے فارغ ہو کر اس طرف توجہ دوں گا کیونکہ یہ میری روح کی پکار تھی ۔اس کے بغیر میں ایک تشنگی محسوس کرتا تھا ۔بلکہ یہ تقاضہ خود اپنے آپ کو بھولنے نہیں دیتا تھا ۔جب بھی کبھی خیال آتا ۔نظریں خلاؤں میں اٹک کر رہ جاتیں ۔ایسا

لگتا جیسے غیب کے اُس پار کوئی مجھے بلا رہا ہے۔کون ہے وہ جسے میرا انتظار ہے۔میرا دل اس انجانی ہستی کے لئے تڑپ اٹھتا مگر پڑھائی کے پریشر کی وجہ سے ایسی کیفیت کبھی کبھار ہی ہوتی۔میرا فائنل امتحان ہو گیا اور اب میں اپنے آپ کو بہت ہی ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔دو تین دن تو گھر میں ہی گزر گئے۔

اب پھر مجھے پہاڑوں پر جانے کا شوق ہوا۔میں نے سمیرا باجی، ثمینہ اور راحیلہ سے ذکر کیا کہ چلو گھوم آتے ہیں۔مگر چار ماہ بعد سمیرا باجی کی شادی طے پائی تھی جس کی وجہ سے ممی نے جانے کی اجازت نہیں دی۔بلکہ ثمینہ اور راحیلہ کو بھی روک لیا کہ چھٹیوں میں تیاری کروا دو۔میں تو تم لوگوں کی چھٹیوں کا انتظار کر رہی تھی۔کیونکہ شاپنگ تم لوگوں کی پسند سے ہو گی۔کہنے لگے بھئی تم عورتوں کے تو مشاغل ہی مختلف ہیں۔تم لوگ کپڑوں کی سلائیوں اور شاپنگ میں لگی رہو گی تو کیا میرا بیٹا گھر میں بور ہوتا رہیگا۔سلمان بیٹے تم اکیلے ہی راولپنڈی ہو آؤ۔اب تو تمھاری لمبی چھٹیاں ہیں۔مہینے دو مہینے رہ آؤ۔میں خوش ہو گیا۔سچ پاپا، میں چلا جاؤں، ہاں بھئی ضرور جاؤ۔یہاں اکیلے کیا کرو گے۔ذرا گھوم پھر آؤ۔پھر تمہاری جاب کے متعلق سوچیں گے۔میں نے جلدی جلدی پیکنگ کی۔لڑکیوں کو کپڑے استری کرنے پر لگا دیا اور رات تک میرا سوٹ کیس تیار ہو گیا پھر میں راولپنڈی پھپھو کے یہاں پہنچ گیا۔پہلا دن تو باتوں میں ہی گزر گیا۔ملے بھی تو پورے ایک سال بعد تھے۔پچھلی گرمیوں میں پھپھو کراچی آئی تھیں۔اس کے بعد نہ ہم جا سکے تھے نہ وہ آسکی تھیں۔

اس ایک سال میں اور تو سب کچھ ویسا ہی تھا مگر زیما میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔یوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر نسوانیت کے تقاضے اُبھر آئے ہیں۔خوبصورت تو وہ پہلے ہی تھی۔اب اس حسن میں بانکپن اور حیا کے رنگ بھی شامل ہو گئے تھے۔اس کی ہنسی میں گھنٹیوں کی کھنک آگئی تھی۔مجھے یوں لگا جیسے کوئی چور دروازے سے میرے دل میں چلا آ رہا ہے۔عقل نے مہمیز لگائی۔ابھی ان چکروں میں نہیں پڑنا ہے۔ابھی تو قدرت کے سربستہ رازوں کو تلاش کرنا ہے۔شادی تو زندگی کا ٹھہراؤ ہے۔ابھی تمہیں بہت آگے بڑھنا ہے۔عقل چاہے دل پر کتنے ہی پہرے لگائے مگر جب دل کے چور دروازے کھل جاتے ہیں تو محبوب کو دل میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔میں نے وقاص بھائی کے ساتھ پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنایا۔وقاص بھائی آج کل جاب کر رہے تھے۔باوجود کوشش کے انہیں چھٹی نہ ملی۔میں نے پھوپھا سے کہا کہ چند دن کے لئے آزاد کشمیر کی پہاڑیوں میں رہنے کو جی چاہ رہا ہے۔میں اکیلا ہی ہو آتا ہوں، پھوپھا کہنے لگے کہ میرا فلاں دوست رہتا ہے۔وہاں چلے جاؤ مگر میں پوری آزادی کے

ساتھ پہاڑوں کی شامیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا سلیپنگ بیگ اٹھایا اور چند ضرورت کی چیزیں کمر پر لاد کر گھر سے نکل کر کشمیر جا پہنچا۔

گھر کے قریب ہی سے پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ وہ شام میں نے ایک پہاڑی پر گزاری۔ اس بلند پہاڑی کی چوٹی پر میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ سورج ڈوبنے لگا، سنہری دھوپ نے سبزے کو اور بھی نکھار دیا۔ میری نگاہیں اُفق پر جم گئیں۔ سنہری روشنی کی لطافت مجھے اپنے سینے کے اندر محسوس ہوئی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا، یوں لگا جیسے اللہ تعالیٰ یہیں کہیں آس پاس موجود ہیں۔ میرا دل اسے دیکھنے کو مچل پڑا۔ ایسی قربت ایسی دوری۔ کس طرح اس قربت اور دوری کے درمیانی فصل کو ڈھادوں۔ ابھی تو فصل ہی کا سراغ نہیں ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے سورج ڈوب گیا۔ میں نے اپنا سلیپنگ بیگ ایک ہموار زمین پر بچھایا اور بیٹھ گیا۔ فضا کی لطافت روئیں روئیں میں بس رہی تھی۔ مجھے فطرت پر پیار آنے لگا۔ دور پہاڑوں کے پار اندھیرا اجالا گلے مل رہا تھا۔ اس لمحے جانے نظروں میں نزیما کہاں سے آن سمائی۔ دور پہاڑوں کے پار سے میرے دل تک ایک راہ بن گئی۔ نزیما اس راہ پر چلتی دکھائی دی۔ میں نے گھبرا کر یہ خیال جھٹکنا چاہا، یا اللہ میں تو تجھے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ یا اللہ میں تو تجھ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرے دل کو غیر کے تصور سے نہ بہلا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ محبت کی کسک لہر بن کر سر سے پاؤں تک میرے اندر دوڑ گئی۔ مجھے لگا نزیما اگر نہ ملی تو میں مر جاؤں گا۔ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ مجھے تو بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے، اس کی قدرت کی نشانیوں کو تلاش کرنے کی جستجو تھی۔ پھر میرے اندر دنیا کے تقاضے کیوں آنے لگے ہیں۔ یا اللہ میں اپنے راستے سے بھٹکنا نہیں چاہتا۔ مجھے راستہ دکھا اور میں نے اللہ کا ورد شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ میرے وجود کو نیند نے اپنی چادر میں ڈھانپ لیا۔ صبح صادق کے وقت پرندوں کی آوازوں نے جگایا، میں نے تھوڑے سے پانی سے منہ دھو کر وضو کیا، چائے پی اور نماز و تسبیح کے بعد مراقبہ میں بیٹھ گیا۔ صبح صبح کے وقت دل دماغ بالکل صاف تھے۔

مراقبہ میں بیٹھ کر ایسا لگا جیسے میں مٹی کا نہیں کاغذ کا بنا ہوا ہوں۔ اصل میں مراقبہ کا مجھے کچھ اتنا پتہ نہیں تھا۔ البتہ شروع ہی سے دادی اماں جب دریا میں غوطہ لگانے کا تصور کرایا کرتی تھیں تو بس اسی تصور کے ساتھ اس وقت بھی میں اللہ کے حضور بیٹھ گیا میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس ہستی کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاؤں۔ اس کے رنگوں میں ڈوب جاؤں۔ کچھ دیر بعد سانسوں کے ساتھ ساتھ بھینی بھینی

خوشبو اندر اترنے لگی۔ احساس اور بھی زیادہ لطیف ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک پر سے بھی زیادہ ہلکا ہوں اور بس اڑا چلا جا رہا ہوں۔ کہاں اڑ رہا ہوں کچھ پتہ نہ تھا۔ بس ایسا لگتا تھا جیسے عمیق اندھیرا ہے، مجھے یہ تو پتہ ہے کہ میں اڑ رہا ہوں مگر کہاں جا رہا ہوں کیوں جا رہا ہوں کچھ پتہ نہیں تھا۔

بہت دیر بعد آنکھ کھولی تو سورج نکل رہا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی سے سورج نکلنے کا منظر اتنا دلکش تھا کہ میں سوچنے لگا جو لوگ شہروں میں رہتے ہیں۔ بند کمروں میں زندگیاں گزارتے ہیں وہ فطرت کی کیسی کیسی نعمتوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ آج مجھے اندازہ ہوا کہ فطرت کتنی معصوم ہے۔ فطرت کے اندر کتنی کشش ہے۔ میری نظر سورج سے ہٹ کر پھر پس منظر کے ہرے بھرے پہاڑوں پر گئی۔ فکر میں پھر یہ سوال ابھرا، پہاڑوں میں کیوں اتنی کشش ہے۔ پہاڑوں کا روحانیت سے کیا تعلق ہے۔ کوئی تو ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کوہ طور پر بلایا۔ حضور پاک ﷺ نبوت سے پہلے غار حرا پر اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرنے کے لئے جاتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑ تسبیح کیا کرتے تھے۔ میں سوچ میں پڑ گیا، ہو نہ ہو پہاڑوں کا روحانی فکر کے ساتھ ضرور کوئی گہرا تعلق ہے۔

میری نظریں دور پہاڑ پر جمی ہوئی تھیں اور ذہن میں نہایت تیزی کے ساتھ خیالات آ رہے تھے۔ پہاڑوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے کہ ''ہم نے پہاڑوں کو زمین کی میخیں بنائی ہیں تا کہ یہ تمہیں لے کر ڈولنے نہ لگے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ Gravity یا قوتِ ثقل کی بنیاد پہاڑ ہیں۔ اگر زمین پر سے پہاڑ ختم کر دیئے جائیں تو زمین کی Gravity ختم ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ بھی نکلا کہ دنیا میں سب سے زیادہ قوتِ ثقل Gravitional Force پہاڑ میں ہے۔ جب ہم پہاڑ کے دامن سے پہاڑ کی بلندی پر نظر ڈالتے ہیں تو پہاڑ کی قوتِ ثقل ہمارے حواس پر غالب آ جاتی ہے۔ اونچے پہاڑ پر چڑھنے کے لئے ہمیں اپنی ہمتوں کو مجتمع کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح ہر شخص میدان یا ہموار زمین پر بغیر کسی ہمت کے ایک دم سے چل پڑتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص پہاڑ پر نہیں چڑھ سکتا کیونکہ پہاڑ کی قوتِ ثقل انسان کے اندر کام کرنے والی قوت ثقل پر حاوی ہو جاتی ہے۔ پہاڑ کو اللہ تعالیٰ نے زمین کی میخیں کہا ہے۔ میخوں سے مراد جمود ہے۔ یہی جمود فکری اعتبار سے مادیت کی فکر ہے۔ آدمی جب پہاڑ کے اندر کام کرنے والی مادی لہروں سے متاثر ہوتا ہے۔ تو اس کے اندر مادی حواس کی لہروں کی رفتار پر جمود طاری ہو جاتا ہے اور اس میں پہاڑ پر چڑھنے کی ہمت نہیں رہتی۔ مگر جب آدمی کا ارادہ پہاڑ کی قوتِ ثقل پر غالب آ جاتا ہے تو وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنے اندر کام کرنے والے

مادی حواس کے جمود کو توڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اورتم دیکھ رہے ہو پہاڑ کہ یہ جمے ہوئے ہیں۔مگر یہ بادلوں کی طرح اُڑ رہے ہیں ''۔

پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر آدمی کے اندر یہ یقین اور احساس حاوی ہو جاتا ہے کہ مادی غلبہ اس کے حواس پر جمود طاری نہیں کرسکتا۔وہ عملی طور پر قوتِ ثقل کی انتہائی فورس کو توڑ چکا ہے۔اس کی فکر مادیت سے ہٹ کر لطافت کی جانب پرواز کرنے لگتی ہے۔ہر مادی جسم کے اندر ایک لطیف جسم موجود ہے۔پہاڑوں کا بادلوں کی طرح اُڑنا، اسی لطیف جسم کا تذکرہ ہے۔آدمی جب اپنے اندر موجود لطیف حواس اور فکر کے ساتھ پہاڑوں پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی نظر گہرائی میں پہاڑوں کے لطیف جسم کا مشاہدہ کر لیتی ہے۔چونکہ پہاڑ مادے کی انتہائی صورت ہے۔چنانچہ اسی مناسبت سے پہاڑ کے اندر کام کرنے والے لطیف جسم کی حرکت لطیف حواس کا پہلا درجہ ہوگا۔پیغمبران علیہ السلام پہاڑوں پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ذریعے اپنے روحانی حواس کو اس ابتدائی درجے سے بتدریج بلند کرتے ہوئے روحانیت کی معراج پر پہنچا دیتے تھے۔اس طرح ان کے حواس نے روحانیت کی پہلی سیڑھی سے لے کر آخری سیڑھی تک جہاں تک اللہ تعالیٰ نے انہیں علوم دینا چاہا۔وہاں تک تمام مدارج کو طے کرلیا اور ان کے روحانی حواس نے ابتداء سے لے کر انتہا تک علوم کی تمام روشنیوں کو جذب کرلیا۔یہی وجہ ہے ان کے علوم باقی تمام لوگوں سے افضل اور کامل ہوئے اور ان کے اندر عام لوگوں کی نسبت نور کو جذب کرنے کی سکت بھی بہت زیادہ تھی۔جس کی وجہ سے ان کے ذریعے معجزات صادر ہوئے۔معجزات نور کی عملی صورت و فعل ہے۔پیغمبران علیہ السلام کے اندر ذخیرہ شدہ نور اللہ تعالیٰ کے ارادے اور حکم کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔

میرا دل اس علمی توجیہہ پر نہایت ہی مسرور ہوا۔میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میرے دل میں پہاڑ پر کچھ عرصہ گزارنے کا تقاضہ پیدا کیا۔میں اپنے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر چلا تھا تاکہ اطمینان سے چوٹی پر کچھ دن گزار سکوں۔سورج کی روشنی بڑھتی جارہی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ وقت کا احساس بھی ہونے لگا۔میں نے تھیلے سے کھانے پینے کی چند چیزیں نکالیں اور خوشی خوشی کھانے لگا۔دل ایسا خوش اور بھرا ہوا تھا کہ جیسے اپنے چاہنے والوں کی محفل میں بیٹھا ہے۔تنہائی کا ذرا سا بھی احساس نہ تھا اور پھر میں تنہا کب تھا فطرت کی بیشمار چیزیں اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ میرے

آس پاس تھیں۔ ابھی تو کسی اللہ کے بندے کی تلاش کرنی ہے جو مجھے قدم قدم چلا کر سمندر کی گہرائی میں لے جائے۔ ابھی تو مجھے سمندر کی تہہ سے موتی مونگے چننے ہیں۔ اے میرے رب مجھے کسی ایسے بندے سے ملا جو مجھے تجھ سے ملا سکے۔ میری روح کا تقاضہ دعا بن کر دل سے نکلنے لگا۔

درختوں پر پرندے چہچہاتے ہوئے اِدھر سے اُدھر پھدک رہے تھے۔ مجھے دادی اماں کی بات یاد آگئی۔ وہ کہتی تھیں بیٹا جو بچے بڑوں کی بات مانتے ہیں۔ مرنے کے بعد ان کی روح چڑیا کی طرح ہلکی پھلکی اور آزاد ہو جاتی ہے۔ پھر وہ غیب میں جہاں جی چاہے اڑتی رہتی ہے۔ میں نے سوچا آزاد فکر کی نشانی یہ پرندے ہیں۔ نہ انھیں کھانے کا غم نہ پینے کی فکر۔ دنیا کے ہر جھمیلے سے آزاد فضاؤں میں اڑتے پھرتے ہیں۔ کاش میری روح بھی چڑیا کی طرح آزاد ہو جائے۔ پھر تو وہ سیدھی اللہ تعالیٰ کی جانب لپکے گی۔ روح کیسی ہوگی اللہ کیسا ہوگا۔ میرا ذہن اندھیرے میں چلنے لگا۔ کتنی دیر گزر گئی تصویر کی کوئی شبیہہ ذہن میں نہیں اُبھری۔ نہ مجھے اپنی روح کا پتہ تھا نہ اللہ کا۔ ذہن میں تصویر اُبھرے تو کیونکر۔

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا۔ ان پہاڑوں میں بھی تو کوئی میری طرح اللہ کی جستجو میں بیٹھا ہی ہوگا۔ کیوں نہ اسے تلاش کیا جائے۔ اس خیال نے جیسے میرے اندر بجلی سی بھر دی۔ میں ایکدم چھلانگ مار کر اٹھ بیٹھا۔ جلدی جلدی سارا سامان سفری بیگ میں رکھ کر فوراً ہی چل دیا۔ دن بھر میں پہاڑوں کے اندر پتلی پتلی پگڈنڈیوں پر چلتا رہا۔ بھوک پیاس لگتی تو کمر سے لٹکے ہوئے بیگ سے کچھ کھا پی لیتا۔ مگر اس سفر میں اس قدر لطف آرہا تھا۔ عجیب عجیب سے درخت، جنگلی پھل اور پھول دکھائی دیتے۔ گھنے درختوں پر ایسے خوبصورت پرندے دکھائی دیتے کہ ان کے بنانے والے کے ہاتھوں کو چوم لینے کو جی چاہتا۔ میں اپنی دھن میں سیٹی بجاتا چلا جا رہا تھا۔ شام ہونے کو تھی۔

جنگل میں پرندوں کا شور مچا ہوا تھا کہ ایک درخت کے پیچھے کسی کی جھلک نظر آئی۔ میں ایک دم سنبھل گیا۔ پھر آہستہ آہستہ درخت کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا تو ایک بزرگ بیٹھے نظر آئے۔ انھوں نے زمین پر ایک موٹی دری بچھائی ہوئی تھی۔ میری آہٹ سنتے ہی اونچی آواز میں سلام کیا اور بولے تم سامنے آسکتے ہو۔ میں درخت کی اوٹ سے باہر آگیا اور بزرگ کو سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا۔ میں ان کے اشارے پر دری پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگے تم یہاں تک کیسے آئے۔ میں نے کہا بس یونہی فطرت کے نظارے دیکھنے کے شوق میں چلا آیا۔ کہنے لگے فطرت کے نظاروں کے پسِ پردہ خود فطرت کو بھی جاننے کا کچھ شوق ہے آپ کو۔ میں ان کے سوال پر ایک دم چونک گیا۔ دل نے کہا ہو نہ ہو یہ ضرور کوئی پہنچے

ہوئے بزرگ ہیں۔ میں نے کہا قبلہ شوق تو بہت ہے مگر پردے میں جھانکنا نہیں آتا۔ کہنے لگے۔ کتنے دن کے لئے یہاں ہو۔ میں نے کہا ایک ہفتے کے لئے۔ بولے ہمارے ساتھ رہو۔ میں نے خوش ہو کر حامی بھر لی۔ مجھے تو یوں لگا جیسے اللہ میاں نے میری دعا سُن لی ہے۔ کہنے لگے۔ بس یہاں بیٹھ کر دو دو رکعت نفل کی نیت باندھ کر ہر رکعت میں الحمد شریف کے بعد تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھو اور سلام پھیر کر اکتالیس مرتبہ یا رحمٰن کی تسبیح کرو۔ بس اسی ترکیب سے صبح تک نفل پڑھتے رہو۔ اس وقت رات ہو چکی تھی۔ ہم سب نے کچھ تھوڑا سا کھانا کھایا۔ بزرگ نے سوکھا حلوہ مجھے دیا۔ کھانا کھا کر ہم نے چند منٹ باتیں کیں اور پھر اپنی عبادت میں لگ گئے۔ بزرگ کا حکم تھا کہ عبادت کے دوران بات نہ کی جائے۔ نہ ایک دوسرے کو دیکھا جائے۔ میرا مصلّٰی انھوں نے اپنی جگہ سے ہٹا کر ایک بڑے سے درخت کی اوٹ میں بچھانے کو کہا تاکہ ہم دونوں کے درمیان درخت کی آڑ رہے۔

میں نے نماز شروع کی میرے لئے زندگی میں یہ پہلا تجربہ تھا۔ جس میں کسی بزرگ کی رہنمائی میں عبادت کر رہا تھا۔ میں خوش بہت تھا کہ اس سلسلے میں کچھ شروعات تو ہوئی۔ ساری رات اسی ترکیب سے نماز پڑھتا رہا۔ مگر ذرا تکان محسوس نہ ہوئی۔ نہ نیند آئی۔ یہاں تک کہ پرندوں کی آوازیں آنے لگیں اور آہستہ آہستہ سیاہ آسمان پر سفید دھاری نمایاں ہو گئی۔ میں نے فجر کی نماز پڑھی اور مراقبہ کرنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے ایک پتلی سی سڑک ہے۔ میں اس سڑک پر چلا جا رہا ہوں۔ راستہ زیادہ روشن نہیں ہے۔ جیسے صبح کا ملگجا اندھیرا سا فضا میں چھایا ہوا ہے۔ دس پندرہ منٹ گزرے تھے کہ بزرگ کی آواز آئی۔ سلمان بیٹے۔ السلام علیکم میں نے سلام کا جواب دیا اور ان کے پاس چلا گیا۔ پوچھنے پر میں نے انھیں بتایا کہ رات بہت جلد گزر گئی۔ ہم دونوں نے ناشتہ کیا اور سو گئے۔ آنکھ کھلی تو دھوپ نکلی ہوئی تھی کہنے لگے بس پانی پی کر شام تک یہ ورد کرتے رہو۔ "یا وہاب، یا اللہ" میں پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا اور مغرب تک یہ ورد کرتا رہا۔

مغرب کی نماز پڑھ کر بزرگ نے مجھے بلا لیا۔ ہم نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور میں وہیں دری پر لیٹ گیا فوراً ہی نیند آ گئی ابھی مشکل سے ایک گھنٹہ ہی سویا ہوں گا کہ بزرگ نے جگا دیا۔ کہنے لگے تمہارے نفل پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ جاؤ اور عشاء کی نماز پڑھ کر صبح تک اسی طرح نفل پڑھتے رہو۔ میں پھر اپنی جگہ پر چلا گیا اور صبح تک اسی طرح عبادت کرتا رہا۔ پھر صبح کی نماز کے بعد مراقبہ کیا۔ پھر اپنے آپ کو ایک پتلے سے راستے پر پایا مگر راستہ زیادہ روشن نہ تھا۔ میں اس پر سنبھل سنبھل کر آہستہ

آہستہ چلتا رہا۔ سارا وقت مراقبہ میں یہی کیفیات رہیں ۔ سات دن اسی معمول پر گزر گئے ۔ ان سات دنوں میں مجھے یہ بزرگ اچھے تو لگے ۔ مگر ان کے لئے میں نے اپنے دل میں اتنی زیادہ محبت محسوس نہیں کی ۔ ان سے بچھڑنے کا مجھے کوئی ملال نہ تھا۔ میں نے ان سے ادب کے ساتھ معانقہ کیا۔ انھوں نے دعاؤں کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔

وہاں سے رخصت ہو کر میں سیدھا پھوپھی کے گھر پہنچا۔ راستے میں زیما میرے ذہن پر چھائی رہی ۔ میں بار بار اس کے خیال کو جھٹکنے کی کوشش کرتا ۔ خیال آتا ۔ میں نے جو اتنی عبادت کی وہ ساری عبادت زیما کے خیال سے ضائع ہو جائے گی ۔ کیونکہ انسان کو صرف اللہ ہی سے محبت کرنی چاہیئے ۔ پھر خیال آتا مگر اللہ ہی نے تو یہ رشتے بنائے ہیں اور ان سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ کے حکم پر اس کی مخلوق سے دوستی رکھنا بھی اللہ کی رضا میں شامل ہے ۔ میرا دل اس تاویل پر مطمئن ہو گیا۔ گھر آیا تو سارے ہی میرے منتظر تھے۔

رات گئے تک باتوں میں مشغول رہے ۔ پھر پھوپھی اور پھوپھا تو سونے چلے گئے ۔ وقاص، زیما اور میں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ جانے کیوں میرا جی نہ چاہا کہ ان لوگوں کو بتاؤں کہ پہاڑ پر میں کیا کرتا رہا۔ بس میں تو فطرت کے نظاروں کی باتیں کرتا رہا۔ سب سمجھے کہ کراچی میں چونکہ قدرتی مناظر کی کمی ہے اس وجہ سے میری دلچسپی ان میں زیادہ ہے ۔ تین چار دن میں اور وہاں رہا۔ میں نے محسوس کیا زیما بھی مجھ میں کافی دلچسپی رکھتی ہے ۔ وہ میرے قریب آنے اور بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔ مگر میں شادی کو روحانی ترقی میں رکاوٹ سمجھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ باوجود چاہنے کے میں اپنے آپ کو الگ رکھنے پر مجبور تھا۔ میں نے پوری کوشش کی کہ زیما کو میرے کسی بھی رویے سے کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے ۔ ورنہ پھر میری شادی کا چکر چل جائے گا۔ جلد ہی میں کراچی لوٹ آیا۔ گھر میں اب بھی ہر روز ثمیرا باجی کی شادی کے تذکرے تھے۔ گھر کی پہلی پہلی شادی تھی ۔ سب ہی بے حد خوش تھے۔ میرے ذمے بھی چند کام لگائے گئے ۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے جاب بھی ڈھونڈنا شروع کر دی ۔ پاپا کے بھی کئی جاننے والے تھے ۔ ایک ماہ کی دوڑ دھوپ کے بعد مجھے ایک جگہ جاب مل گئی ۔ اسی دوران میرا رزلٹ بھی آ گیا تھا۔ اللہ پاک نے مجھے کامیاب کر دیا تھا ۔ اب گھر میں بہت سی خوشیاں اکٹھی تھیں ۔

ایک تو پاس ہونے کی خوشی دوسرے جاب کی خوشی تیسرے ثمیرا باجی کی شادی، ممی تو ہر وقت کچھ نہ کچھ بولتی ہی نظر آتیں ۔ یہ کر دو، وہ کر دو۔ انھیں تو بس یہی گھبراہٹ تھی کہ شادی میں کوئی کمی نہ رہ

جائے۔ میں اپنی جاب میں مصروف ہوگیا۔ ایک ماہ تک تو مجھے بہت لگ کر کام کرنا پڑا۔ کمپنی کے سارے سسٹم کو سمجھے بغیر کام بھی نہیں چل سکتا تھا۔ لیکن جلد ہی سیٹ ہوگیا۔ اب شادی میں صرف دو ہفتے رہ گئے تھے۔ کام سے گھر آیا تو ثمینہ نے بتایا کہ کل زیما باجی اور سیماں پھوپھی آ رہی ہیں۔ پھوپھا اور وقاص بھائی شادی پر آئیں گے۔ زیما آ رہی ہے میرے دل میں خوشی کا ایک فوارہ سا پھوٹ پڑا۔ دوسرے دن زیما اور پھوپھی آ گئیں۔ اب ہر روز رات کو محلے کی لڑکیاں جمع ہو جاتیں اور خوب گانے بجانے ہوتے۔ میں اکثر سلیم کے گھر جا بیٹھتا اور ہم دونوں روحانی موضوع پر کوئی نہ کوئی بات چھیڑ دیتے۔ اسے معلوم تھا کہ میں ان باتوں میں کتنی دلچسپی رکھتا ہوں۔ اسے میں نے پہاڑ والے بزرگ کے ملنے کا سارا قصہ سنایا۔ مگر میں نے یہ بھی بتایا کہ ان سے مل کر مجھے اتنی تسلی نہیں ہوئی۔ ابھی تک میرے اندر تلاش موجود ہے۔ سلیم کہنے لگا۔ میرے ایک دوست ہیں۔ اُدھیڑ عمر کے ہیں۔ وہ بھی بہت اچھی باتیں کرتے ہیں۔ ان کی بعض باتیں تو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ تم سے ملواؤں گا۔ میں نے کہا۔ ہاں شادی کے بعد اطمینان سے اس طرف لگوں گا۔ شادی ہوگئی۔ سمیرا باجی کے شوہر ندیم بھائی بہت اچھے اور باوقار انسان تھے۔ ان کا خاندان بھی کافی بڑا تھا۔ ان کے چاچے، مامے وغیرہ بہت سارے تھے۔ مگر خاندان میں باہم اتفاق و محبت بہت تھی۔ سمیرا باجی کے گھر سے جانے کے بعد گھر کچھ اور سونا ہوگیا اور اب راحیلہ اور ثمینہ زیادہ تر اکٹھی دکھائی دیتیں۔ زیما اور تمام مہمان جا چکے تھے۔ میرا بھی وہی معمول ہوگیا۔ میں آفس کے بعد زیادہ تر وقت قرآن باترجمہ پڑھنے اور مختلف کتابوں کے پڑھنے میں گزارتا۔

اسی دوران ایک دن سلیم کا فون آیا کہ میرے گھر آؤ جن صاحب کا تم سے ملوانے کا وعدہ تھا وہ آئے بیٹھے ہیں۔ میں گیا تو ایک صاحب نہایت معقول شکل وصورت کے بیٹھے تھے۔ ان سے باتیں ہوئیں۔ انہوں نے میرے بہت سے سوالوں کے جواب دیئے۔ مگر شاید جس روشنی کی تلاش مجھے ہے وہ ان سے نہیں مل سکتی۔

ایک دن میں نے خواب میں دیکھا، میں سات آٹھ سال کا بچہ ہوں۔ دادی اماں میرا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔ دادی اماں میرا ہاتھ پکڑ کر دریا میں کود جاتی ہیں۔ ہم جلد ہی دریا کی تہہ میں پہنچ جاتے ہیں تہہ میں دریا بالکل سوکھا ہے۔ یہ ایک شہر کی طرح ہے۔ ہم ایک راستے پر چلتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر ایک پہاڑی نظر آتی ہے۔ ہم اس پر چڑھ جاتے ہیں۔ یہاں زمین پر ایک بزرگ بیٹھے ہیں۔ زیادہ بوڑھے نہیں ہیں۔ بلکہ پچاس ساٹھ سال کے درمیان ہوں گے۔ سفید کرتا شلوار پر سیاہ واسکٹ۔ ہلکی سی

داڑھی، دادی اماں کہنے لگیں۔سلمان یہ صاحب تمہیں اس شہر کی سیر کرائیں گے۔میں تمہیں ان کے سپرد کرتی ہوں۔یہ کہہ کرانہوں نے میرا ہاتھ ان صاحب کے ہاتھ میں دے دیا اور خود غائب ہو گئیں۔ان صاحب نے مجھے گلے سے لگایا۔میرے اندر جیسے بجلی سی دوڑ گئی اور میری آنکھ کھل گئی۔

سارا خواب فلم کے سین کی طرح آنکھوں میں آ گیا۔مجھے یقین ہو گیا کہ دادی اماں کو میرا اب بھی بہت خیال ہے اور اب ضرور میں اپنی مراد پا جاؤں گا۔زندگی اپنے معمول پر تھی۔ایک دن ہم سب سمیرا باجی کے یہاں گئے۔وہاں ایک شخص بالکل اسی شکل وصورت کے بیٹھے تھے۔جیسے میں نے خواب میں دیکھا تھا۔انھیں دیکھتے ہی میں ایک دم چونک گیا۔سمیرا باجی نے تعارف کرایا۔سلمان یہ ندیم کے تایا ابو ہیں۔شادی پر باہر تھے۔جس کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے۔میں نے سلام کر کے بیٹھنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے آگے بڑھ کر نہایت محبت کے ساتھ مجھے گلے لگا لیا۔مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا خواب دن کے حواس میں منتقل ہو گیا ہے۔گلے ملتے ہی سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔وہ کئی منٹ تک گلے سے لگائے کھڑے رہے۔میں نے بڑھ کر ان کے ہاتھ چوم لیے۔یہ سب غیر ارادی طور پر تھا۔ایک کشش تھی جو مجھے ان کی جانب کھینچ رہی تھی۔باتیں کوئی خاص نہ تھیں۔سب کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں تھیں۔بس صرف ایک سوال انہوں نے کیا۔سلمان میاں خواب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔میں نے کہا، جناب کچھ خواب سچے بھی ہوتے ہیں۔فوراً بولے دریا میں غوطہ لگانے کا کیا مطلب ہے۔میں نے کہا جناب یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں۔وہ مسکرا دیئے۔ندیم بھائی بولے۔سلمان تایا ابو بہت چھپے رستم ہیں۔یہ روحانی علوم میں بہت آگے ہیں۔میں نے کہا۔جناب بچپن ہی سے ان علوم کو جاننے کا شوق ہے۔اب تو قسمت نے آپ سے ملوا ہی دیا ہے۔کیا کبھی آپ مجھے بھی کچھ وقت دیں گے۔وہ مسکرا دیئے۔جس وقت چاہو غریب خانے پر آ سکتے ہو۔تم تو اپنے ہی بچے ہو۔وہ وقت ختم ہوا۔ہم اپنے گھر لوٹ آئے۔مگر عجیب بات تھی جتنی دیر وہاں رہا ایک کشش تھی جو ان صاحب کے قریب رہنے پر مجبور کرتی تھی۔دل بار بار کہہ رہا تھا۔تمہارا خواب شرمندۂ تعبیر ہو چکا ہے۔یہی وہ بزرگ ہیں۔یہی وہ روشنی ہے جس کا تمہیں انتظار تھا۔

گھر آنے کے بعد بھی وہ بزرگ میرے ذہن سے محو نہ ہوئے۔دوسرے دن بھی مجھے ان سے ملنے کی تڑپ ستانے لگی۔ایک جھجک مانع تھی۔تیسرے دن بھی دفتر سے آ کر جی چاہا ابھی چلا جاؤں۔بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سمجھایا کہ وہ بھی کیا سوچیں گے کہ اتنی جلدی چلا آ رہا ہے۔مگر چوتھے دن تو

کسی طرح صبر نہ ہو سکا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ اتفاق سے انھوں نے ہی دروازہ کھولا ۔سلام کرتے ہی گلے سے لگالیا ۔آؤ بھئی ۔ہم تو کب سے تمہارے انتظار میں ہیں ۔اب میں پھر چونک اٹھا۔ضرورانہیں میری حالت کا علم ہے ۔میں نے جھجکتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنا خواب سنایا اور پہاڑ پر جانے کا حال بھی سنا دیا ۔کہنے لگے ۔روحوں کی ملاقات تو عالم ارواح میں ہوتی ہے ۔وہاں پر وہ جن سے مانوس ہوچکی ہیں ۔یہاں بھی ان سے مانوس ہوجاتی ہیں ۔ہنس کر بولے ۔لگتا ہے ہماری روحیں بھی عالمِ ارواح میں ایک دوسرے سے مانوس ہوچکی ہیں ۔میں بھی ہنس پڑا۔اب میرے اندر وہ جھجک دور ہوچکی تھی ۔گفتگو کے دوران میں نے انھیں بچپن میں دادی اماں کے ساتھ دریا میں نہانے کے مراقبہ کے متعلق بتایا۔وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ویسے بھی وہ کم ہی بولتے تھے ۔میں انھیں اب تایا جان بولنے لگا تھا۔تقریباً ایک گھنٹہ ہوگیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے ان کا قیمتی وقت کافی لے لیا۔اسی خیال کے تحت میں نے جانے کی اجازت طلب کی ۔کہنے لگے پھر کب آؤ گے۔ میں بے ساختہ بول اُٹھا کل آجاؤں گا۔مسکرا کے فرمایا کل آجاؤ۔رخصت ہوتے وقت پھر گلے ملے ۔ دوسرے دن ہم دونوں تقریباً دس پندرہ منٹ تک بالکل چپ چاپ بیٹھے رہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سی قوت تھی جس نے میری قوتِ گویائی سلب کر لی تھی ۔مجھ پر ایک رعب چھایا ہوا تھا۔بالآخر سکوت ٹوٹا ۔بولے سلمان میاں ! کیا چاہتے ہو۔میں نے انتہائی ادب کے ساتھ کہا۔حضور میں چاہتا ہوں کہ آپ میری روحانی تربیت فرمائیں ۔کہنے لگے ۔کاغذ قلم لاؤ۔ میں دوڑ کے گاڑی سے نوٹ بک اور پین لے آیا ۔کہنے لگے ۔ لکھو........

باادب بانصیب - بےادب بےنصیب

''یہی روحانیت کا پہلا سبق ہے اور یہی روحانیت کا آخری سبق ہے ۔اس پہلے اور آخر کے درمیان تمام علوم مقامِ ادب کے درجات ہیں ۔ یہ سبق ہمیشہ یاد رکھنا ۔روحانی علوم ادب کے دائرے میں منتقل ہوتے ہیں ۔ادب کے دائرے سے باہر روحانی علوم حاصل نہیں کئے جاسکتے ۔آدم نے غلطی کا مرتکب ہوکر بھی ادب کا دامن نہ چھوڑا اور اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ معافی کا خواستگار رہا۔اللہ تعالیٰ نے اس کی درخواست قبول کر لی اور اسے اپنی بارگاہ سے معتوب نہیں کیا۔مگر ابلیس نے نافرمانی کا ارتکاب کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے حجت کی کہ تو نے مجھے میرے راستے سے ورغلا دیا اور جس طرح تو نے مجھے راستے سے ورغلایا میں بھی تیرے بندوں کو تیرے راستے سے ورغلاؤں گا۔ذات باری تعالیٰ کو

چیلنج دینے اور حجت کرنے سے ابلیس راندۂ درگاہ ہوا۔اس نے ادب کے دائرے سے باہر اپنے پاؤں نکال لئے تھے۔یاد رکھو۔ادب کے دائرے سے باہر پاؤں نکالنے والا راندۂ درگاہ ہے۔راندۂ درگاہ کو اللہ تعالٰی کے علوم کی روشنی حاصل نہیں ہوسکتی۔ادب کے دائرے میں علم ہے۔روشنی ہے اور ادب کے دائرے سے باہر جہالت ہے۔تاریکی ہے۔ادب کے دائرے میں روشنی کے مدارج روحانی علوم ہیں۔"

جیسے جیسے میں یہ تحریر لکھتا جاتا ویسے ویسے اس کی لہریں میرے اندر منتقل ہوتی محسوس ہوئیں۔ یوں لگا جیسے میں خود ایک تختی ہوں اور اس تختی پر آپ کا کلام نقش ہوتا جا رہا ہے۔کلام ختم کر کے کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔میں اپنی ہمت یکجا کر کے اپنی جگہ سے اُٹھا اور آپ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔سر جھکا کر مؤدبانہ انداز میں عرض کی۔حضور اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔فرمایا کہو۔میں نے کہا مجھے بیعت کر لیجئے۔مجھے روحانی علوم سیکھنے کا بے پناہ شوق ہے۔مسکرائے۔پھر سر پر ہاتھ رکھا۔کہا آنکھیں بند کرو۔میں نے بند کر لیں تو کافی دیر تک دم کرتے رہے۔پھر میرے سر پر چوم لیا۔کہا آج سے تم ہماری روحانی اولاد ہو۔میرے اندر خوشیاں لہریں بن کر دوڑی تھیں۔فرمایا۔آج سے تم روزانہ رات کو سوتے وقت اور صبح فجر کے وقت مراقبہ کرو گے۔پہلے وضو کر کے مصلے پر بیٹھ کر سو بار درود خضری پھر سو بار یاحیی یا قیوم پڑھ کر آنکھیں بند کر کے شیخ کا تصور کرو کہ شیخ تمہارے سامنے بیٹھا ہے اور شیخ کے قلب سے روشنیاں نکل کر تمہارے قلب میں داخل ہو رہی ہیں۔پہلے پندرہ منٹ تک یہ مراقبہ کرنا پھر بتدریج اس کی مدت بڑھاتے رہنا۔کچھ دن تم یہی سبق کرو۔پھر ہمارے پاس آنا۔میں نے ادب سے ہاتھ چومے۔سلام کیا اور گھر چلا گیا۔پہلے دن جب میں نے تصور شیخ کا مراقبہ کیا تو ذہن بہت یکسو ہو گیا۔دل کو سکون ملا۔ایک تحفظ کا احساس تھا۔ایک ہفتے بعد ذہن اس قدر یکسو ہو گیا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلتا کہ میں کہاں ہوں۔بالکل بے خیالی کی حالت ہو جاتی۔جب ہوش آتا تو پتہ چلتا۔ایک دن مراقبہ کر رہا تھا کہ آواز آئی شیخ احمد کے بیٹے مبارک ہو۔آج مراقبہ کا نواں دن تھا میں نے سوچا یہ کیفیت بتانی چاہیئے۔تاکہ معلوم ہو کہ مراقبہ کیسے چل رہا ہے یہ سوچ کر میں نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہنے اور شیخ احمد کے پاس چل دیا۔انھیں جا کر اپنی کیفیت بتائی کہ مراقبہ میں بیٹھتے ہی بے خیالی کی کیفیت ہو جاتی ہے۔مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا۔فرمایا یہ انخلائے ذہنی کی حالت ہے۔آدمی کے اندر دو دماغ کام کر رہے ہیں۔ایک دماغ لاشعور ہے۔دوسرا دماغ شعور ہے۔لاشعوری دماغ اور حواس غیب میں دیکھتے ہیں۔جب کہ شعوری حواس مادی دنیا کے

حواس ہیں۔ جاگنے کی حالت میں شعوری حواس غالب رہتے ہیں اور سونے کی حالت میں لاشعوری حواس غالب آجاتے ہیں۔ مراقبہ کرنے سے شعوری دماغ آہستہ آہستہ مغلوب ہوجاتا ہے اور لاشعوری دماغ کی تحریکات غالب آنے لگتی ہیں۔ مگر لاشعوری حواس کا غلبہ نیند کی حالت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے خیالی کی کیفیات پیدا ہوجاتی ہیں۔ میں نے پوچھا۔ بے خیالی کی کیفیت سے مراقبہ کرنے والے کو کیا حاصل ہوتا ہے۔ فرمایا چونکہ مراقبہ ارادی حرکت ہے۔ اس لئے اس کے اندر بے خیالی بھی ارادی حرکت ہے۔ بے خیالی کی کیفیات اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب شعوری دماغ کے منتشر خیالات تصور کے ایک نقطہ میں جذب ہوجائیں۔ اب شعور کے لئے تصور کا یہ نقطہ لاعلمی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعور اس نقطے کی گہرائی میں جاکر گم ہوجاتا ہے۔ یعنی نقطے کی گہرائی میں جو روشنیاں اور علوم ہیں۔ شعور ان سے مانوس نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسے معنی پہنانا نہیں جانتا۔ مراقبہ کی مشقوں سے شعور آہستہ آہستہ لاشعور کی روشنیوں سے مانوس ہوجاتا ہے اور پھر وہ ان روشنیوں میں معنی پہنانا سیکھ لیتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ اس سٹیج پر شیخ کی کیا ذمہ داری ہوتی ہے۔ کہنے لگے۔ وہی جو ایک دھوبی کی۔ میں نے پوچھا وہ کیسے۔ کہنے لگے۔ مرید دنیاوی طرزِ فکر چھوڑ کر روحانی طرزِ فکر اپناتا ہے۔ دنیاوی طرزِ فکر ذہن میں میل کچیل اور کثافتیں جمع کردیتی ہے۔ شیخ مرید کی ذہنی حالت سے واقف ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں وہ مرید کی ذہنی کثافتوں کو دھو کر اس کی طرزِ فکر کو صاف کرتا رہتا ہے تاکہ جب اس کا ذہن لاشعور کے راستے پر چلے تو اس راستے کی ہر شے کو پہچان لے اور صحیح معنی پہنا سکے۔ کیونکہ کسی بھی شے کی اچھائی یا برائی کا انحصار اس کے معنی پہنانے میں ہے۔

میں بڑی باقاعدگی سے مراقبہ کے اسباق کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن با ترجمہ بھی روزانہ پڑھتا اور اب قرآنی آیات کا مفہوم زیادہ واضح طور پر میرے اندر اتر جاتا۔ شیخ سے میری انسیت دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ وہ بھی میرے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے تھے۔ اب انھوں نے مجھے صبح کے وقت سانس کی مشقیں کرنے کا حکم دیا۔ فرمانے لگے۔ صبح فجر کے وقت آہستہ آہستہ ناک سے اندر سانس لو۔ خوب گہرا۔ پھر اس سانس کو اپنے اندر کچھ دیر روکے رکھو جتنی دیر روک سکو۔ پھر منہ سیٹی کی طرح گول کر کے آہستہ آہستہ سانس باہر نکال دو۔ اس طرح روزانہ گیارہ سانس لیا کرو۔ پھر مراقبہ کرنا۔ میں نے پوچھا۔ جناب سانس لینے سے مراقبہ کا کیا تعلق ہے۔ کہنے لگے۔ جب اندر سانس لی جاتی ہے۔ تو ذہن کا رابطہ ہمارے اندر (Inner) سے قائم ہوجاتا ہے۔ اور جب باہر سانس لی جاتی ہے۔

تو ذہن کا رابطہ باہر کی دنیا سے قائم ہو جاتا ہے۔ سانس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ آکسیجن کی آمد و رفت ظاہری حواس اور باطنی حواس دونوں کے رابطہ کو بحال رکھتی ہے۔ اس طرح ظاہری اور باطنی حواس میں بیلنس قائم ہو جاتا ہے اور اس کا اثر طرزِ فکر پر مثبت انداز میں پڑتا ہے۔

اس دوران جب میں یہ مشقیں کر رہا تھا۔ ایک دن رات کے کھانے پر چچی کہنے لگیں۔ سلمان کل سیماں باجی کا فون آیا تھا۔ تمہیں پوچھ رہی تھیں۔ اتنے میں راحیلہ بول پڑی۔ زیما باجی آپ کو یاد کر رہی ہیں اور شرارت سے ہنس پڑی۔ میں چونک گیا۔ کیا بات ہے چچی۔ چچی کہنے لگیں پہلے منہ میٹھا کراؤ پھر بتاؤں گی۔ میں ذرا پریشان ہو گیا۔ چچی کیا بات ہے جلدی سے بتائیں نا۔ وہ بولیں۔ سیماں باجی نے زیما کے لئے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ میں بے ساختہ بول پڑا۔ ابھی کیا جلدی ہے انھیں۔ می بولیں۔ اے لو بائیس سال کی عمر ہونے کو آئی ہے اور ابھی کیا جلدی ہے۔ میں انھیں جلدی جواب دینا چاہتی ہوں۔ میں گھبرا گیا جس لائن پر لگ گیا تھا۔ اس میں پوری دل جمعی کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے می سے کہا ابھی مجھے کچھ عرصہ شادی نہیں کرنی ہے۔ می کہنے لگیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ زیما تمہیں پسند ہے۔ میں نے کہا۔ ہاں اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ می نے کہا۔ تمہیں اس شادی میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ میں نے کہا کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر ابھی میں کم از کم دو سال شادی کرنا نہیں چاہتا۔ پاپا بولے۔ مگر اس کی وجہ بھی تو کوئی ہوگی۔ میں نے کہا ہاں ہے۔ میں ابھی کچھ روحانیت کے اسباق کر رہا ہوں۔ پہلے انھیں پورا کرنا چاہتا ہوں۔ ورنہ میرا ذہن بٹ جائے گا۔ می کہنے لگیں۔ اب انھیں ہم کیا جواب دیں۔ میں نے کہا آپ کہہ دیں کہ وہ ابھی سیٹ ہونا چاہتا ہے۔ دوسرے دن چچی نے بتایا کہ سیماں پھوپھی یہ سن کر بالکل خاموش ہو گئیں۔ میرے دل کو ایک تسلی تھی کہ زیما میرا انتظار کرے گی۔

میں نے لاپروائی سے بات کو بھلا دیا۔ اس دوران شیخ احمد نے مجھے ایک دن چھوڑ کر روزے رکھنے کا حکم دیا۔ فرمایا کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا عمل ہے۔ وہ بھی ایک دن کی آڑ میں روزے رکھتے تھے۔ پیغمبرؑ کے کسی بھی عمل میں ان کی مخصوص طرزِ فکر کام کرتی ہے۔ جب آدمی ان کی اتباع کی نیت سے وہ عمل کرتا ہے۔ تو اس عمل کے ساتھ پیغمبر علیہ السلام کی وہ مخصوص فکر بھی اس کے اندر منتقل ہوتی ہے۔ اس طرح عمل کے نتائج میں آدمی پیغمبر علیہ السلام کی طرزِ فکر کے مطابق مفہوم و معنی پہناتا ہے اور چونکہ پیغمبر علیہ السلام کی طرزِ فکر عین ارادۂ الٰہی کے مطابق ہے۔ اس وجہ سے ان کی پیروی کرنے والوں کی طرزِ فکر بھی اللہ تعالیٰ کی رضا و ارادے کے مطابق ہو جاتی ہے۔ میں نے پہلے روزے کی سحری کرتے وقت

بڑے سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے دعا کی یا اللہ میں یہ روزے حضرت داؤد علیہ السلام کی اتباع میں رکھ رہا ہوں ۔جس طرح آپ نے انھیں اس عمل کا صلہ عطا فرمایا مجھے بھی عطا فرمائیے۔اس دعا کے وقت میرے ذہن میں یہ بھی خیال تھا کہ تمام پیغمبران علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے چنیدہ بندے ہیں۔جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوعِ انسانی سے ممتاز فرما کر بنی آدم کے لئے نمونہ بنایا ہے۔ان کے مخصوص اعمال اور مخصوص عبادات سے جو روحانی صلاحیتیں ایک پیغمبر کے اندر متحرک ہوئیں۔دراصل وہی اعمال ہمارے لئے بھی ایک ایسا وظیفہ ہے جس کے کرنے سے ہمارے اندر بھی روحانی صلاحیتیں ہماری سکت کے مطابق بیدار ہوسکتی ہیں۔میں نے اللہ سے دعا کی کہ اللہ پاک مجھے زیادہ سے زیادہ حوصلہ اور سکت عطا فرما کہ میں روحانی علوم کو سیکھ سکوں اور تیری رضا کے مطابق ان علوم کو تیرے بندوں تک پہنچا سکوں۔

میرے روزے رکھنے کا شور سارے خاندان میں مچ گیا اور سب کو پتہ لگ گیا کہ میں بیعت ہو چکا ہوں اور روحانی علوم سیکھنے میں پوری طرح متوجہ ہوں۔بجائے اس کے کہ لوگ میری اس کاوش پر مجھے سراہتے اور میری حوصلہ افزائی کرتے ہر طرف سے یہی سننے میں آیا۔میاں چھوڑو بھئی کن چکروں میں پڑ گئے۔کوئی کہتا ابھی تو تمہارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ابھی کچھ گناہ تو کرلو پھر ثواب کے چکر میں پڑنا۔میاں شادی کرلو تمہارے سر سے روحانیت کا بھوت اتر جائے گا۔ارے تم جیسا نوجوان بغیر داڑھی مونچھ کہیں روحانی علوم حاصل کرسکتا ہے۔

مجھے روزے رکھتے تین ماہ ہوگئے۔اس دوران مراقبہ میں بہت ہی لطف آتا۔ایسی ایسی کیفیات ہوتیں کہ مراقبہ سے نکلنے کو جی نہ چاہتا۔خواب بھی بہت اچھے اچھے آنے لگے تھے۔ایک دن میں نے خواب دیکھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام آئے میں نے انھیں فوراً پہچان لیا۔نہایت ہی ادب سے انھیں سلام کیا۔آپ مسکرائے اور مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ہم ایک راستے پر چلنے لگے۔ابھی چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ ایک بڑا سا شہر کا دروازہ سامنے آگیا۔یہ دروازہ انتہائی بڑا اور خوبصورت تھا۔یہ ماربل کا بنا ہوا تھا۔مگر اس کے اندر سلور اور گولڈن ماربل کا کام تھا عجیب وغریب چیز تھی۔میں دیکھتا ہی رہ گیا۔حضرت داؤد علیہ السلام اس دروازے میں یہ کہہ کر داخل ہوئے کہ یہ ہمارا ملک ہے اندر روشنیوں کا ایک وسیع وعریض عالم تھا۔ہر طرف روشنیاں تھیں مگر ہر جگہ مختلف لگتی تھیں ہم ایک ہال میں داخل ہوئے۔یہاں پر ایک تخت تھا جس پر انتہائی نفیس قالین بچھا تھا۔اس قالین پر بھی سلور اور گولڈن ڈیزائن تھے۔کمرے کی سجاوٹ میں بھی یہی دو رنگ نمایاں تھے۔حضرت داؤد علیہ السلام اس قالین پر بیٹھ گئے

اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔اس کے بعد ایک خادم ٹرے میں رکھ کر کچھ پھل لایا۔حضرت داؤد علیہ السلام نے وہ پھل مجھے دیئے جو میں نے کھا لئے۔ان کا مزہ میرے سارے جسم میں محسوس ہوا۔پھر آنکھ کھل گئی۔

شیخ احمد نے پہلے ہی کہا ہوا تھا کہ ہر خواب مجھے ہی بتانا۔یہ خواب میں نے شیخ احمد کو بتایا۔ فرمانے لگے۔چونکہ تم سنتِ داؤدی پر عمل کرتے ہوئے ان کے طریق پر روزے رکھ رہے ہو۔اس عمل کے ذریعے سے حضرت داؤد علیہ السلام کی فکر سے تمہارا رابطہ قائم ہو گیا ہے۔پھل کھانا، ان کا فیض ہے۔جو تمہیں منتقل ہوا ہے۔

میں نے کہا حضور خواب کیا ہے۔ ہر خواب سچا کیوں نہیں ہوتا اور مرشد کو خواب بتانا کیوں ضروری ہے۔شیخ احمد نے فرمایا مرشد کو خواب اس لئے بتایا جاتا ہے کیونکہ مرید زیرِ تربیت ہے۔خواب کے تمثلات سے مرشد مرید کی روحانی صلاحیتوں اور طرزِ فکر اور ذہن کی گہرائی کو پہچان لیتا ہے۔اس طرح تربیت میں آسانی ہو جاتی ہے۔خواب کے علوم روحانی علوم کا ایک حصہ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے خواب کے علوم یوسف علیہ السلام کو عطا فرمائے۔قرآن نے سورۂ یوسف میں سچے خوابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ خواب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک سچے خواب، یہ خواب روح کی انفارمیشن ہیں۔روح کی نظر عالمِ غیب میں دیکھتی ہے۔جو کچھ دیکھتی ہے۔اس کی اطلاع شعور کو دیتی ہے۔شعور میں سکت نہ ہونے کی وجہ سے روح کی یہ اطلاعات ایک فلیش کی طرح گزر جاتی ہیں۔یہ فلیش دماغ کے وہ خیالات ہیں جنھیں ہم واہمہ کہتے ہیں۔ذہن انھیں فوراً بھلا دیتا ہے۔یہ شعور میں ریکارڈ نہیں ہوتے۔اگر روح کسی انفارمیشن کو شعور میں ریکارڈ کرانا چاہتی ہے۔تو وہ اس انفارمیشن کو نیند کی حالت میں ذہن کے پردے پر منتقل کر دیتی ہے۔ایسے تمام خواب سچے ہوتے ہیں۔جن میں روح کی جانب سے کوئی نہ کوئی اطلاع ہوتی ہے۔ چونکہ روح کی اطلاع غیب کی اطلاع ہے۔غیب میں وقت کا تعین دنیاوی اعتبار سے مختلف ہے۔جیسے نوری سال اور دنیاوی سال۔ٹائم اینڈ اسپیس کا فرق ہونے کی وجہ سے خواب کی تعبیر معلوم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔غیب میں دیکھی ہوئی شئے کو دنیاوی اعتبار سے معنی پہنانا خواب کی تعبیر ہے۔مگر یہ وہی بتا سکتا ہے جو خواب کی نیچر سے واقف ہو۔یہی وجہ ہے کہ خواب کی تعبیر کے علوم پیغمبر کو عطا ہوئے۔تا کہ لوگ اس بات کو جان لیں کہ خواب زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں، اگر کوئی ایسا شخص جو خواب کی تعبیر نہ جانتا ہو۔اس سے خواب کی تعبیر پوچھی جائے گی تو وہ اپنی عقل و شعور سے معنی پہنائے

گا۔جس کی وجہ سے جو اطلاع روح دینا چاہتی ہے، وہ اطلاع آدمی کو صحیح طور پر پہنچ نہیں سکے گی اور اطلاع دینے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔پھر اس اطلاع میں جو معنی پہنائے گئے اسی پر عمل بھی کیا جائے گا، تو عمل بھی غلط ہو جائے گا اور روح کا مدعا پورا نہ ہوگا، یہی وجہ ہے کہ خواب ہر کسی سے نہیں کہنا چاہیئے ۔

دوسری قسم کے خواب ہماری عملی زندگی کا عکس ہوتے ہیں۔شعور کی سطح مجلاّ ہے ۔جیسے آئینہ ہوتا ہے ۔جب دن میں آدمی عمل کرتا ہے ۔تو اس سطح پر ان اعمال کا عکس پڑتا رہتا ہے ۔کبھی نیند کی حالت میں یہ عکس نمایاں ہو جاتے ہیں۔جسم مثالی کی نظر ان پر پڑ جاتی ہے ۔ایسے خواب ذہن کا عکس ہوتے ہیں ۔یہ خواب دن بھر کے اعمال کا ریکارڈ ہیں ۔ میں نے کہا اگر کوئی آدمی بار بار ڈراؤنے خواب دیکھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ذہن خوفزدہ ہے یا اگر کوئی خواب ایک سے زیادہ مرتبہ دیکھا جائے تو اس کا کیا مطلب ہوگا ۔شیخ احمد نے فوراً فرمایا ۔اگر تم کو تین مرتبہ کہوں کہ رک جاؤ۔ میں نے فوراً کہا ۔تو میں رک جاؤں گا۔بولے کیوں؟ میں نے کہا تین مرتبہ کہنے میں حکم پر اصرار ہے ۔کہنے لگے ایک سے زیادہ مرتبہ خواب کا دیکھنا بھی اس بات کی علامت ہے کہ روح اس اطلاع پر یا خواب کے تمثلات پر شعور کی توجہ دلانا چاہتی ہے ۔بار بار ڈراؤنے خواب دیکھنے کا مطلب بھی یہی ہے ۔روح یہ اطلاع دینا چاہتی ہے کہ اپنے اندر سے خوف و ہراس کو ختم کر دیا جائے ۔

ان ہی دنوں میں نے خواب دیکھا کہ نریما کے ہاتھوں میں مہندی لگائی جا رہی ہے اور میں دور کھڑا نہایت ہی رنج کے ساتھ اس منظر کو دیکھ رہا ہوں ۔ میں نے اسے اپنے ذہن میں چھپے ہوئے اندیشے سے محمول کیا اور نظر انداز کر دیا۔نریما کے متعلق میں نے پیر و مرشد سے کبھی ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ اس وجہ سے بھی یہ خواب بتا نہ سکا ۔اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ میرے متعلق سارے خاندان میں چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں ۔کوئی کہتا ہے مولوی ہو گیا ہے ۔کوئی کہتا ہے پٹڑی سے اتر گیا ہے ۔ میں نے کبھی ان باتوں کا اثر نہیں لیا ۔میری دادی اماں کہا کرتی تھیں ۔ بیٹا سنو سب کی، کرو اپنی ۔انسان کی عقلِ سلیم آدمی کو کبھی دھوکہ نہیں دیتی ۔عقلِ سلیم پیدا کرو۔ میں معصومیت سے کہتا۔کیا سلیم کی عقل بہت اچھی ہے دادی اماں ۔ وہ ہنستیں مجھے چوم کر کہتیں ۔نہیں بیٹے میرے سلمان کی عقل سب سے اچھی ہے ۔یہی تو عقلِ سلیم ہے ۔ ان دنوں تو مجھے عقلِ سلیم کا مطلب سمجھ نہیں آتا تھا مگر آج معلوم ہو گیا ۔

شیخ احمد نے ایک مرتبہ فرمایا تھا ۔ بیٹے انسان کے دماغ سے نور کی ایک رو گزرتی ہے ۔جب آدمی اس نور کو جذب کر لیتا ہے تو اس کے شعور کی سطح آئینے کی طرح شفاف ہو جاتی ہے اور ذہن کے

اوپر منعکس ہونے والے خیالات کا عکس صاف پڑتا ہے۔اس صاف اور شفاف عکس کو شعور صحیح معنی پہناتا ہے۔ دراصل معنی پہنانے والی قوت شعور کی سطح پر جذب شدہ نور ہے۔ ذہن کا یہی نور عقلِ سلیم ہے۔ جو ذہن کے پردے پر منعکس ہونے والے تصورات میں معنی پہناتا ہے۔اسی کے لئے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''مومن کی فراست سے ڈرو۔مومن اللہ کے نور سے دیکھتا''۔ ذہن کا یہی نور انسان کے اندر صحیح طرزِ فکر منتقل کرتا ہے۔میرے لئے سب سے اطمینان والی بات یہ تھی کہ پاپا میرے اس لائن میں آنے سے بے حد خوش تھے۔وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ آخر دادی اماں کا بیٹا ہے نا۔انھیں کا اثر تو آئے گا۔وہ دادی اماں کے متعلق اب اکثر ایسی باتیں بتایا کرتے جو پہلے مجھے کسی نے نہیں بتائی تھیں۔

ایک دن کہنے لگے۔ بیٹے جب تم چند ماہ کے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے۔انڈیا سے تمہارے دادا ابا اوردادی اماں کے بہت پرانے پڑوسی بمع فیملی آئے۔وہ سب یہاں پر اپنی بیٹی کی شادی کے لئے آئے تھے۔انھیں اس کی تیاری وغیرہ کے لئے اور تقریب کے لئے کچھ عرصہ ٹھہرنے کی ضرورت تھی۔دادی اماں بہت خوش ہوئیں۔فوراً ان کے لئے اوپر کی منزل خالی کی گئی۔وہ بہت اچھے اورعبادت گزار لوگ تھے۔خصوصاً لڑکی کی والدہ جو دادی اماں کی بہت گہری دوست تھیں۔تہجد گزار تھیں۔ایک دن صبح صبح وہ نیچے آئیں اورتمہاری امی سے کہنے لگیں۔اے بہو! کیا رات کو صحن کے جنگلے میں تالا لگانا بھول گئی تھیں۔میں رات کو تہجد کے لئے اُٹھی تو نیچے صحن میں تمہاری اماں کو کھڑے دیکھا۔وہ صحن میں کھڑی جانے فضا میں کیا دیکھ رہی تھیں۔میں تو پھر اپنی نماز میں لگ گئی۔ میں بھی وہیں کھڑا تھا۔ میں ایک دم بول پڑا۔باجی صبح تو میں نے خود جنگلے کا دروازہ کھولا ہے۔اس کے تالے کی چابی بھی ایک ہی ہے۔جو میں اپنی تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا ہوں۔میں تو رات کو اسے اچھی طرح خود سوتے وقت دیکھ کرسوتا ہوں۔آپ کو دھوکا تو نہیں ہوا۔وہ بولیں۔اے لو میں تو کتنی دیر اوپر کھڑی انھیں دیکھتی رہی کہ اتنی رات کو کیا صحن میں تہجد پڑھ رہی ہیں مگر وہ تو بس فضا میں دیکھ رہی تھیں۔میں اور تمہاری امی یہ سن کر اچنبھے میں پڑ گئے۔ہم نے تمہاری دادی اماں سے اس کے متعلق دریافت کیا۔وہ بولیں بیٹے یہ میرا اور اللہ کا معاملہ ہے اور بس پھر نہ انھوں نے کچھ بتانا ضروری سمجھا۔نہ ہم کو کچھ پوچھنے کی ہمت پڑی۔

شیخ احمد نے فرمایا۔''سلمان رات کو جاگ کر کم از کم آدھا گھنٹہ ضرور عبادت کیا کرو۔مجھے معلوم ہے کہ تم کو صبح دفتر جانا ہوتا ہے۔مگر رات کو گھنٹہ آدھا گھنٹہ جاگ سکتے ہو۔کچھ اثر نہیں پڑے گا''۔

میں نے کہا، ''سرکار مجھ سے زیادہ آپ مجھے بہتر جانتے ہیں۔ آپ مجھے تعمیل حکم میں غافل نہیں پائیں گے''۔ اب میں نے راتوں کو اُٹھ کر نفل اور مراقبہ کرنا شروع کر دیا۔ آدھی رات کو کچھ اور ہی عالم تھا۔ میں گھنٹہ گھنٹہ مراقبہ میں بیٹھا رہتا اور پھر بھی طبیعت پر ذرا دباؤ نہ پڑتا۔ یوں لگتا جیسے شیخ کی روشنیاں اور انوار نہایت تیزی سے میرے اندر جذب ہوتے جا رہے ہیں۔ اب میں صرف رات کو تین چار گھنٹے سے زیادہ نہ سوتا۔ مگر کام پر بھی بالکل ٹھیک ٹھاک رہتا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ذہن چلتا۔ کمپیوٹر پلے کرنے کی اسپیڈ بھی تیز ہوگئی تھی۔ منیجر مجھ سے بہت خوش تھے۔ مگر ممی کبھی کبھی پریشان ہو جاتی تھیں۔ کبھی بادام گھونٹ کے دودھ میں پلاتیں اور کبھی شہد کھلاتیں۔ بے چاری ہر وقت میری صحت کے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔ میں انھیں سمجھایا کرتا کہ ممی میں بالکل تندرست ہوں۔ آپ میری فکر نہ کیا کریں۔ مگر ممتا کا معاملہ ہی الگ ہوتا ہے۔ میں چپ کر کے وہ سب کچھ کھا پی لیتا۔ ویسے بھی اچھا کھانا پہننا کس کو بُرا لگتا ہے۔

شیخ احمد سے ایک دن میں نے پوچھا کہ ''دن کی نسبت رات کو عبادت اور مراقبہ کرنے سے کیوں زیادہ فائدہ ہوتا ہے''۔ کہنے لگے ''ہر شئے میں اللہ کی ایک مخصوص فکر کام کر رہی ہے۔ یہ فکر اس شئے کی حکمت ہے۔ جس کی بنیاد پر اسے پیدا کیا گیا ہے۔ رات کے اندر اللہ تعالیٰ کا یہ تفکر کام کر رہا ہے کہ رات مخلوق کے لئے آرام کرنے کو بنائی گئی ہے۔ مخلوق کے لئے رات کو آرام کرنے کا حکم فکر کا ایک رخ ہے۔ یہ رخ تمام مخلوق اور خصوصاً عوام الناس کی جانب ہے۔ یعنی عوام الناس کے لئے اللہ تعالیٰ کا ایک جنرل حکم ہے کہ اس کے بندے رات کو آرام کریں۔ مگر چونکہ ہر شئے دو رخوں میں بنی ہے۔ اس وجہ سے ایک رخ جب عوام الناس کے لئے ہوگا تو فکر کا دوسرا رخ لازمی طور پر خواص الناس کے لئے ہوگا۔ دوسرے رخ میں خواص الناس کے لئے یہ حکم ہے کہ رات کو جاگ کر عبادت کرو چونکہ اس حکم میں خواص کے لئے ہدایت ہے۔ چنانچہ ان خاص بندوں پر ان کی سکت کے مطابق انعام بھی اتارا جاتا ہے۔ رات کے حواس نیند کے حواس ہیں۔ یعنی رات نیند کی ظاہری شکل و صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتے ہیں:

> ''نیند عارضی موت ہے۔ نیند کی
> حالت میں روح قبض کر لی جاتی
> ہے اور اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس
> بلاتے ہیں۔ پھر ایک وقت معینہ

پر اسے واپس جسم میں لوٹا دیتے
ہیں۔مگر ایک وقت ایسا بھی آتا
ہے جب روح کو اللہ تعالیٰ اپنے
پاس روک لیتے ہیں اور واپس جسم
میں نہیں لوٹاتے''۔

اس آیت سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ رات کے حواس میں یعنی نیند کے عالم میں روحیں غیب میں سفر کرتی ہیں۔غیب اللہ ہے۔اب چونکہ ہمارا جسم ایک مشین ہے۔اس مشین میں کمپیوٹر فٹ ہے۔جو ایک نظام کے ذریعے مشین کو جاری رکھے ہوئے ہے۔اس نظام میں کمپیوٹر میں یہ فیڈ ہے کہ رات سونے کے لئے بنی ہے رات کو سویا جائے۔کمپیوٹر کے پروگرام کے الٹ مشین کو حرکت دی جاتی ہے۔یعنی روٹین کے پروگرام کی جگہ خصوصی پروگرام فیڈ کیا جاتا ہے۔جو یہ ہے کہ رات جاگنے کے لئے بنی ہے۔رات کو جاگا جائے۔اب روٹین الٹ جائے گی چونکہ رات کو آپ سونے کی بجائے جاگ رہے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ شعوری طور پر نیند کے حواس میں داخل ہو گئے۔سونے کی حالت میں شعور نیند کے حواس میں داخل نہیں ہوتا۔صرف لاشعور یعنی نیند کے حواس اپنی حرکت جاری رکھتے ہیں۔نیند کے حواس غیب کے حواس ہیں۔جب شعوری حواس نیند کے حواس میں داخل ہو جاتے ہیں تو انھیں غیب کا انکشاف ہو جاتا ہے اور غیب ان کے مشاہدے میں آجاتا ہے۔رات چونکہ نیند کے حواس کی ظاہری صورت ہے اس وجہ سے رات کو عبادت کرنے والا عملی طور غیب میں سفر کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسے جلد کامیابی ہوتی ہے۔

رات کو جاگنے اور روزے رکھنے سے میرے اندر یہ بہت بڑی تبدیلی آگئی کہ میرا ذہن اب قرآن کے مفہوم کو بہت تیزی سے اور گہرائی میں اخذ کرنے لگا۔جس کا مجھے ہمیشہ سے شوق تھا۔حضرت شیخ احمد کے پانچ اور بھی مرید تھے۔سارے کے سارے مجھ سے بڑے تھے۔سب ہی ادھیڑ عمر کے تھے۔بابا جی ہفتے میں ایک دن اجتماعی لیکچر اور مراقبہ کراتے۔اس دن ہم لوگ اپنی اپنی کیفیات و واردات بھی انھیں بتایا کرتے تھے۔میری واردات و کیفیات دوسروں سے مختلف ہوتیں۔پھر میں قرآن کی آیات کو جس طرح سمجھتا وہ بھی سنا دیا کرتا تھا۔تاکہ اصلاح ہو سکے۔ہمیشہ شیخ احمد کے منہ سے سبحان اللہ، ماشاءاللہ کے الفاظ نکلتے۔میرے باقی ساتھی کبھی کبھار کہہ اُٹھتے۔''حضور! اس عمر میں انھیں اتنی عبادت کی ضرورت ہی

کیا ہے''۔کبھی کہتے''زیادہ اس طرف پڑ جاؤ گے تو شادی کے قابل نہ رہو گے''۔کبھی کہتے''ارے بھئی ذرا ہولے ہولے قدم رکھو''۔میں ہنس کر بھول جاتا۔چند دن بعد آفس کی چار دن کی چھٹی تھی۔شیخ احمد نے مجھے تین دن رات کھجور کی سحری وافطاری کا مسلسل روزہ رکھنے کا حکم دیا۔اس کے ساتھ ہی بات کرنے کو بھی منع فرما دیا۔کہنے لگے یہ حضرت ذکریا علیہ السلام کا روزہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے انھیں تین دن مسلسل روزہ رکھنے کا حکم دیا تھا اور اس روزے میں بات کرنے سے بھی منع کر دیا تھا۔اس روزے کے بعد انھیں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت دی گئی تھی۔فرمانے لگے تم ہمارے پاس آؤ اور تین دن اس کمرے میں ٹھہرو۔میں نے گھر میں روزے کا ذکر نہیں کیا۔کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ ممی بہت گھبرا جائیں گی۔ویسے بھی میں کسی کو اس کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔اپنی عبادت کا ذکر کرنے سے مجھے بڑی شرم آتی تھی۔

میں سوچتا تھا کہ عبادت تو اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرنے کا ذریعہ ہے۔یہ تو ہر کسی پر لازم ہے کہ وہ اپنے رب سے رابطہ قائم کرے۔اپنی سکت کے مطابق جیسے جی چاہے کرے۔اس میں کسی کو کیا بتانا۔شیخ احمد بھی یہی کہتے تھے کہ عبادت وریاضت چھپا کر کرنی چاہیئے۔یہ اللہ اور بندے کا معاملہ ہے۔اس میں تیسرے کو کیا دخل ہے۔

البتہ ظاہری عبادت اس کے لئے روا ہے۔شیخ احمد کے مخصوص کمرے میں تین دن کے لئے ٹھہر گیا۔مجھے اور عبادت کے ساتھ ساتھ کثرت سے یا حیی یا قیوم کا ورد بتایا۔کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔روزے سے پہلے شیخ احمد نے میرے اوپر دم کیا مجھے دعا دی اور کمرے میں بند کر دیا۔ان تین دنوں میں میں نے کوشش کی کہ بالکل نہ سوؤں پہلی رات تو بالکل نیند نہ آئی۔مگر دوسری رات تھوڑی دیر کو نیند میں چلا گیا۔تیسری رات بھی بہت تھوڑی دیر کے لئے سو گیا تھا۔باقی تمام وقت زیادہ تر مراقبہ میں گزرا۔مجھے ایسا لگا جیسے میں بہت ہی لائیٹ ہو گیا ہوں۔تیسری رات میرے اندر سے ایک اور سلمان نکلا۔جو میری ہی طرح کا تھا۔مگر روشنی کی طرح ہلکا پھلکا تھا۔وہ نکل کر سیدھا شیخ احمد کی طرف گیا۔وہ سو رہے تھے۔تھوڑی دیر وہ کھڑا انھیں عقیدت سے دیکھتا رہا۔پھر اپنے گھر گیا۔گھر کے تمام افراد دکھائی دیئے۔پھر وہ اوپر اُٹھنے لگا۔اُٹھتے اُٹھتے وہ ایک نورانی عالم میں پہنچ گیا۔وہاں پر خوبصورت فرش پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ ان میں میری دادی بھی تھیں۔جیسے ہی اس نے دادی اماں کو دیکھا۔ایک دم سے لپٹ گیا۔دونوں ہی بے انتہا خوش تھے۔دادی اماں نے خوبصورت بلوریں گلاس میں کچھ مشروب پلایا۔اس کا مزہ صحیح طور پر جانے کیا تھا۔مگر میرے منہ میں مٹھاس سی گھل گئی۔میں حیران تھا کہ اس نے

روزے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ وہاں بیٹھا ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ یہاں میرا یہ حال تھا کہ میں اسے دیکھ تو رہا تھا۔ مگر اس کی باتیں میری سمجھ میں نہ آئیں۔ میرے اوپر گھمبیر سنجیدگی طاری تھی۔ جسم پر بالکل سکوت تھا۔ بہت دیر تک وہ وہاں بیٹھا ضیافتیں اڑاتا رہا اور میں بت کی طرح ساکت بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ میری طرف آیا اور سر کے راستے سے پورے جسم میں لہروں کی طرح سما گیا۔ اس وقت میں نے گہرا سانس لیا۔

تین دن کے بعد مغرب کے وقت شیخ احمد نے دروازہ کھولا۔ میں نے ان کے قدم چھو لئے۔ انھوں نے مجھے گلے سے لگایا۔ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ وہاں پیر بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ کھانے کو بٹھایا۔ کھانے کی بہت سی چیزیں تھیں۔ میں نے تھوڑی سی مونگ کی دال کی کھچڑی آہستہ آہستہ کھائی۔ حلق اندر تک بالکل سوکھ رہا تھا۔ کچھ کھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ شیخ احمد فرمانے لگے تھوڑی دیر بعد پھر کچھ کھا لینا۔ آہستہ آہستہ طبیعت بحال ہو جائے گی۔ وہ رات اجتماعی مراقبہ کی رات تھی۔ تھوڑی دیر میں دوسرے ساتھی بھی جمع ہو گئے۔ میرے اوپر تھوڑی سی نقاہت طاری تھی۔ تین دن خاموش رہنے کے بعد بولنے کو جی بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ میرے ساتھی یہ سمجھے کہ میں بیمار ہوں۔ مگر شیخ احمد نے انھیں بتایا کہ اس نے تین دن کا روزہ رکھا تھا۔ پھر انھوں نے مجھے اپنی کیفیات بیان کرنے کو کہا۔ میں نے آہستہ آہستہ جسم سے ایک اور جسم نکلنے کی ساری روئداد سنا دی۔ فرمانے لگے ''یہ لطیف جسم روشنیوں کا جسم ہے۔ جسے جسمِ مثالی کہتے ہیں۔ یہی جسم نیند کی حالت میں غیب میں داخل ہوتا ہے اور غیب میں رہتا بستا ہے۔ مرنے کے بعد ہماری زندگی اسی جسم کی زندگی ہوگی۔ مٹی کے جسم سے ہمیشہ کے لئے اس جسم کا تعلق ٹوٹ جائے گا۔ مرنے کے بعد کا عالم ''اعراف'' کہلاتا ہے۔ تم نے اعراف کی سیر کی اور اس عالم میں روح کس کس سے ملتی ہے۔ وہ بھی دیکھ لیا۔ یہ موت کا تجربہ ہے۔ روحانیت میں یہ منزل بہت اہمیت رکھتی ہے۔ موت حواس کی تبدیلی کا نام ہے۔ روح جب ایک عالم سے دوسرے عالم میں پہنچتی ہے تو اس کے حواس تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی کو موت کہتے ہیں۔ موت وہ لمحہ ہے۔ جس لمحے ناسوتی حواس غیب کے حواس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ناسوتی حواس احساس کی لہریں ہیں۔ جب کہ غیب کے حواس احساس سے ناآشنا ہیں۔ موت وہ لمحہ ہے جس لمحے غیب کے حواس میں احساس کی لہریں داخل ہو جاتی ہیں۔ اس لمحے جسمِ مثالی یا روشنیوں کا جسم احساس سے روشناس ہو جاتا ہے''۔ میرے دوسرے ساتھیوں کو بھی اس تجربے کا شوق ہوا۔ کہنے لگے ہم بھی تین دن کا روزہ رکھیں گے۔ مگر شیخ احمد نے یہ کہہ کر انھیں

منع کر دیا ابھی نہیں ۔ایک بھائی ضد کرنے لگے کہ کیوں ہم کیوں نہیں رکھ سکتے ۔یہ کیوں رکھ سکتے ہیں ۔ ان کی حجت سے مجھے یہ سب بہت برا لگا ۔بڑا ہی افسوس ہوا ۔شیخ احمد نے نہایت ہی تحمل مزاجی سے انھیں سمجھایا کہ پریشان نہ ہوں ۔انسان کے اپنے اندر کے ایسے ہی سفلی جذبات روحانی راستے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں ۔روحانی راستے میں چلنے والے سب بھائی بہن ہوتے ہیں ۔بھائی بھائی کا آپس میں حسد کرنا نہایت ہی بری بات ہے ۔اس سے کسی کو بھی فائدہ نہیں پہنچتا ۔نہ مرشد کو کہ اس کا تو ٹائم ضائع ہو گیا ۔محنت اکارت ہوگئی اور مرید تو اپنی ہی غلط طرز فکر کی وجہ سے مارا جاتا ہے ۔آئندہ احتیاط رکھیں اور کوشش کریں کہ اس قسم کے واقعات پھر ظہور میں نہ آئیں ۔شیخ احمد نے میرے روزے کم کر کے ہفتے میں صرف جمعرات اور جمعہ کا روزہ رکھنے کا حکم دیا ۔مراقبہ تصور شیخ جاری تھا ۔ ڈیڑھ دو ماہ اس طرح گزر گئے ۔ایک دن دفتر سے گھر آتے ہی راحیلہ نے خبر سنائی ۔سلمان بھائی آپ کو پتہ ہے ۔آج ہی سیماں پھوپھی کا فون آیا ہے ۔کل زیما کی منگنی ہو رہی ہے ۔میرے اندر جیسے کوئی شیشہ چھن سے ٹوٹ گیا ۔میں نے الفاظ دہرائے منگنی ہو رہی ہے ۔راحیلہ نے کہا ۔جی ہاں ۔بڑی مشکل سے میں نے کہا ۔کس سے؟ اس نے کہا کوئی انجینئر ہے ۔سمیع اللہ خان ۔اچھا ،کہہ کر میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور بستر پر اوندھے منہ گر گیا ۔کچھ عرصہ پہلے دیکھا ہوا خواب مجھے یاد آ گیا ۔میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا میرے اندر ایک شور برپا تھا ۔ایسا کیوں ہوا ۔دل یہ کہتا یہ سب تمہاری لاپروائی کا نتیجہ ہے ۔میں کہتا مگر میں تو اللہ کی تلاش میں نکلا تھا ۔اس نے میری خوشیوں کا خیال کیوں نہ رکھا ۔عقل نے سمجھایا بیوقوف تم نے اپنے دل کی بات کسی کو کہی کب ہے؟ کہ وہ تھوڑا عرصہ انتظار کر لیتے ۔جوان لڑکی گھر میں ہو تو ماں باپ کی راتوں کی نیندیں اڑ جاتی ہیں ۔دل نے عقل کی بات مان لی ٹھیک ہے قصور اپنا ہی ہے ۔مگر اب میں کیا کروں ۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی اسی وقت پتہ چلا تھا کہ زیما کی محبت اندر ہی اندر میرے دل کی گہرائیوں میں جڑ پکڑ چکی ہے ۔

اب میری وہ حالت تھی کہ جیسے کوئی قدم بڑھاتا اور سامنے سے زمین نکل جائے ۔مجھے ہر طرف اندھیرا نظر آتا ہے ۔ تھوڑی دیر میں کھانے کے لئے پکارا گیا ۔میں نے بہانہ کر دیا کہ طبیعت خراب ہے ۔یہ سن کر امی چلی آئیں ۔اس وقت مجھے کسی کا ملنا گوارا نہ تھا ۔میں نے مصنوعی مسکراہٹ سے انھیں ڈھارس دی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں ۔آج دوپہر آفس میں کچھ زیادہ کھا لیا تھا ۔اس وقت فاقہ کرنا ہی اچھا ہے ۔وہ مطمئن ہو کر چلی گئیں ۔اب میرا دل بڑی بے چارگی کے ساتھ یہ دعا کرنے لگا کاش یہ منگنی

رک جائے ۔بہرحال وہ رات بڑی بے چینی میں کٹی۔کوشش کے باوجود نہ نیند آئی نہ خیال سے زیما کا تصور ہٹا۔دوسرے دن شام کو گھر والوں نے فون پر منگنی کی مبارک باد دی۔پھوپھی نے معذرت کی کہ چونکہ اچانک ہی رشتہ طے ہوا تھا۔جس کی وجہ سے آپ کو بتا نہ سکے۔اب شادی کی تاریخ پہلے سے مقرر کر کے سب کو اطلاع دیں گے۔دن گزرتے رہے دو ہفتے گزر گئے۔میں بے خوابی کا مریض بن گیا۔ رات رات بھر منتیں کرتا مگر نیند تو جیسے زیما کے ساتھ ہی روٹھ گئی تھی۔کیا کروں کیا نہ کروں۔رات کو زیادہ سے زیادہ وقت مراقبہ کرتا۔مگر تصور شیخ کی جگہ زیما کا چہرہ ابھر آتا۔

پندرہ بیس دن اسی حالت میں گزر گئے۔ میں اپنے دل کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا۔اجتماعی مراقبہ کی محفل میں جاتا تو وہاں چپ چپ بیٹھا رہتا۔آخر ایک دن شیخ احمد نے پوچھ ہی لیا۔سلیمان کیا بات ہے۔میں نے اداس نظروں کے ساتھ کہا کچھ نہیں وہ چپ ہو گئے۔مگر جب سب چلے گئے تو مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔بولے اب بتاؤ۔میرے تو صبر کے سارے پیمانے ٹوٹ چکے تھے۔مزید اب گنجائش ہی نہ تھی۔میں نے ان کی گود میں سر رکھ دیا اور بلک اُٹھا۔حضور مجھے سنبھال لیجئے۔وہ میرے سر اور پیٹھ کو سہلاتے رہے۔مجھے یوں محسوس ہوا ان کے ہاتھوں سے توانائی کی لہریں نکل کر میرے اندر داخل ہو رہی ہیں۔آہستہ آہستہ مجھے سکون آتا چلا گیا۔وہ چار پانچ منٹ تک اسی طرح میری بیک (Back) پر ہاتھ پھیرتے رہے۔جب سکون آ گیا تو میں اُٹھ بیٹھا اور انھیں سارا قصہ سنایا۔وہ مسکرا دیئے بولے"بیٹا جب مرید مرشد کا ہاتھ پکڑ کر روحانی راستے پر قدم رکھتا ہے تو مرید کی تعلیم کا ایک نصاب بن جاتا ہے۔اسی نصاب کے ساتھ مرید روحانی تعلیم حاصل کرتا ہے۔روحانی تعلیمات دنیاوی تعلیمات سے مختلف ہیں۔دنیاوی نصاب کتابوں کی صورت میں ہوتا ہے۔جسے پڑھ کر علوم حاصل کئے جاتے ہیں۔مگر روحانی علوم روشنی ہیں۔یہ روشنیاں منتقل ہوتی رہتی ہیں پھر آہستہ آہستہ حواس کے دائرے میں ان کو محسوس کیا جاتا ہے۔روحانی نصاب اسمائے الٰہیہ کے علوم کا ایک دائرہ ہے۔ہر طالب علم اپنے اپنے دائرے میں تعلیم حاصل کرتا ہے۔روحانی راستے پر چلنا یا مرشد کی رہنمائی میں روحانی علوم حاصل کرنے سے مراد یہ ہے کہ مرید مرشد کے ساتھ روحانی طور پر روشنیوں کے اس دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔جیسے جیسے وہ قدم بڑھاتا ہے ویسے ویسے وہ اس دائرے کے اندر موجود روشنیوں کا ادراک کرتا ہے۔یعنی اس دائرے کی روشنیاں مرید کے باطن میں جذب ہو جاتی ہیں اور مرید کی صلاحیت بن جاتی ہیں۔جس بندے سے جہاں کام لینا ہوتا ہے۔اسی کے مطابق اس کی تیاری ہوتی

ہے۔تم یہ ہرگز بھی نہ بھولو کہ تم روحانی علوم کی روشنیوں کے دائرے میں چل رہے ہو۔تمہاری زندگی کا ہر لمحہ ان روشنیوں کا ادراک ہے۔روشنیوں کا یہی ادراک تمہاری صلاحیتیں ہیں۔قدرت نے تمہارے لئے جاگنے کا پروگرام جاری کیا ہے۔سونے اور غافل ہونے کا نہیں۔یہ دنیا عالِم اسباب ہے۔حواس کے دائرے میں جب علم کی روشنی منتقل ہوتی ہے تو اسباب و سائل تخلیق ہوتے ہیں۔شعور اسباب و وسائل کے دائرے میں علوم کی روشنی کو جذب کرتا ہے۔شعور کا علم کی روشنی کو جذب کرنا انسان کا احسان سے روشناس ہونا ہے یہی عملی زندگی ہے۔احسان کے دائرے میں یہ روشنیاں اپنا عمل ختم کر کے واپس لاشعور میں لوٹ جاتی ہیں۔لاشعور علم ہے۔شعور حواس ہے۔انسان علم اور حواس دونوں کا مجموعہ ہے۔مگر علم جب تک حواس کے دائرے میں داخل نہیں ہوتا آدمی کی صلاحیت نہیں بنتا۔دوسرے لفظوں میں آدمی خود اپنے باطن کی صفات سے ناواقف رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ روحانی طالبعلم کے اندر مرشد اپنے تصرف سے لاشعوری تحریکات تیز رفتار کر دیتا ہے۔تاکہ اس کے شعور میں علم کی روشنی زیادہ سے زیادہ جذب ہو۔مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اسباب وسائل کے دائرے میں دنیاوی تکالیف اور خوشیوں کو بھی محسوس کرتا ہے اور چونکہ وہ روحانی علم کی روشنیوں کے دائرے میں ہے۔اس وجہ سے اس کے احساس میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔

میں نہایت ہی توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ان سے مجھے بے حد سکون و آرام مل رہا تھا۔انھوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا۔ہم تمہیں ایک قصہ سناتے ہیں۔تم جو جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اسمائے الٰہیہ کے علوم عطا فرمائے اور آدم کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا ہے۔یعنی آدم کو بہ حیثیت نائب کے اختیارات سونپے ہیں۔یہ اختیارات کائناتی امور کے دائرے میں ہیں۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''ہم نے تمہارے لئے ساری کائنات کو مسخر کر دیا ہے''۔اللہ تعالیٰ نے بہ حیثیت خالق کے کائنات کے تخلیقی نظام بنا دیئے۔پھر ان تخلیقی فارمولوں کے علوم اور تخلیقی نظام کے علوم اپنے نائب آدم کو سکھا دیئے۔علوم سکھانے کے بعد آدم کو نیابت کے دائرے میں اختیارات سونپ دیئے۔آدم نیابت کے دائرے میں کائناتی امور پر کام کرتا ہے۔کائناتی امور کا ایک شعبہ تکوین کہلاتا ہے۔اس شعبے میں کام کرنے والوں کی خاص ٹریننگ ہوتی ہے۔اسی ٹریننگ کا ایک حصہ جاگنے کا عمل ہے۔اس عمل کو عمل استرخا کہتے ہیں۔اس عمل میں چالیس دن رات مسلسل لاشعوری حواس میں اضافہ ہوتا ہے۔جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس رات کے لئے کوہِ طور پر بلایا گیا۔یہاں دن کا لفظ اسی لئے حذف کر دیا گیا کہ

چالیس دن رات لاشعوری حواس میں گزارنے کا حکم تھا۔

لاشعور علم ہے۔علم مرکزیت ہے۔مرکزیت فکر کا نقطہ ہے۔نقطہ روشنی ہے۔یہ روشنی جب اپنے نقطے سے پھیلتی ہےتو دائرہ بن جاتی ہے۔یعنی شعور کا احاطہ کر لیتی ہے۔روشنی کے اس احاطے میں شعور اس روشنی کو جذب کرتا ہےاور احساس سے روشناس ہوتا ہے۔لاشعور کی صفت محیط ہے یعنی غالب آنے والی اور شعور کی صفت مغلوب ہے۔شعور کا مغلوب ہو جانا نیند کی حالت ہے۔عملِ استرخا میں شعور کو نیند سے دور رکھا جاتا ہے۔مگر شعور یعنی آدمی اسی وقت جاگتا رہ سکتا ہے جب اس کی تمام تر توجہ لاشعور کی جانب مرکوز ہو۔یعنی اس کے ذہن کی مرکزیت قائم ہو جائے۔جب ذہن کی مرکزیت قائم ہو جاتی ہےتو شعور اس مرکزیت سے روشنی حاصل کرتا ہےاور اس توانائی سے وہ لاشعور کی روشنیوں کو زیادہ سے زیادہ جذب کرنے لگتا ہے اور زیادہ سے زیادہ علم حاصل ہو جاتے ہیں۔پھر پیر و مرشد نے فرمایا۔اب ہم تمھیں وہ قصہ سناتے ہیں۔جس کی یہ تمہید ہے۔عقاب کو جب ٹرینڈ کیا جاتا ہےتو چالیس دن اسے سونے نہیں دیتے۔اس کے ساتھ اس کا ٹرینر بھی جاگتا رہتا ہے اور دن رات اس کی ٹریننگ کرتا ہے۔یعنی ٹرینر کی ساری توجہ عقاب پر ہوتی ہےاور وہ اپنی تمام تر محنت و کاوش کے ساتھ اس کو شکاریات کے لئے تیار کرتا ہے۔ایک مرتبہ اہلِ تکوین کو کسی امور پر کام کرنے کے لئے بندے کی ضرورت پڑی تو اس ٹرینر کا انتخاب کیا گیا۔کیونکہ وہ پہلے ہی لاشعوری حواس سے واقف تھا۔چنانچہ اوپر والوں نے بہت کم عرصے میں اسے اپنے کام کے لئے تیار کر لیا۔

یہ قصہ سن کر اور شیخ احمد کی باتیں سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔مجھے یوں لگا جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ مسکرا رہا ہوں۔شیخ احمد نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیہ انداز میں فرمایا۔’’رنج نہ کرو بیٹے۔اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے‘‘۔سکون تو آ گیا۔مگر یہ ظالم دل اب بھی یہی کہہ رہا تھا۔کاش زیما میری ہو جائے۔اگلے دن شیخ احمد نے مجھے بلوایا۔فرمانے لگےتم آدھی رات کو اُٹھ کر لا کا مراقبہ کرو۔لا کے انوار وہ تجلیات ہیں جو وحدانیت کا تعارف کراتے ہیں۔رات کو اُٹھ کر باوضو پہلے دو رکعت نفل پڑھنا۔ہر رکعت میں الحمد کے بعد سو بار الم ذالک الکتاب سے لے کر یومنون بالغیب تک پڑھنا۔پھر بیٹھ کر سو بار لا الہ پڑھ کر مراقبہ کرنا۔مراقبہ میں یہ تصور کرنا کہ تمہارے دل کے اندر ایک سیاہ نقطہ ہے۔تم اس نقطہ کی گہرائی میں داخل ہو رہے ہو۔اتنے دنوں سے جاگ کر مجھے جیسے جاگنے کی عادت پڑ گئی تھی۔اس رات اگرچہ میری بے قراری میں تڑپ نہ تھی۔مگر پھر بھی مجھے نیند نہ آئی۔میں شروع رات میں تو

کچھ دیر لیٹا رہا۔کوشش کرتا رہا کہ سو جاؤں ۔مگر جب نیند نہ آئی تو قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنے لگا۔ ذہن جیسے اللہ تعالیٰ کے کلام میں گم ہو گیا۔ بہت ہی سرور محسوس ہونے لگا۔

کافی دیر کے بعد جب گھڑی پر نظر پڑی تو دو بج چکے تھے۔ میں نے اُٹھ کر وضو کیا۔فریج سے اورنج جوس کا ایک گلاس پیا اور پیر و مرشد کے بتائے ہوئے سبق کو شروع کیا دل پہلے ہی بہت لطیف ہو رہا تھا۔مراقبہ کرتے ہی تصور قائم ہو گیا۔کیا دیکھتا ہوں کہ میرے دل کے اندر سیاہ روشنائی کا چمکتا ہوا ایک نقطہ ہے۔ جو سیاہ ہونے کے باوجود بھی نمایاں ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس کے قریب جاتا ہوں اور اس نقطے میں قدم رکھ دیتا ہوں۔ یہ نقطہ ایک اندھے کنوئیں کی مانند ہے اس میں سیڑھیاں ہیں۔ میں اندھیرے میں سیڑھیاں اترتا ہوں۔مگر میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ بلکہ اس اندھیرے میں بھی میرے قدم خود بخود درست پڑ رہے ہیں۔ بہت ساری سیڑھیاں اترنے کے بعد دروازہ کھلا۔خیال آیا کہ یہ میرے لئے کھلا ہے۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔اندر بہت ہی خوبصورت روشنی تھی جیسے مرکری۔ ذہن میں اللہ کے نور کا خیال آیا میں اس میں بڑھتا چلا گیا۔بس نور کا ایک عالم تھا۔مگر ہر قدم پر نور کی مختلف صفات کا احساس ہوتا۔کبھی یہ نور نہایت ہی ملائم اور باریک سلک کی طرح جسم سے لپٹا محسوس ہوتا۔کبھی یہ نور ہوا کے جھونکے کی طرح محسوس ہوتا۔کبھی انتہائی لطیف رنگین روشنی کے بادل کی طرح دکھائی دیتا۔میری تمام تر توجہ نور پر تھی۔جتنی دیر مراقبہ قائم رہا۔ذہن نور کے تصور میں گم رہا۔

اگلے دن مراقبہ میں سیاہ نقطے کے اندر داخل ہوتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دل کے اندر سیاہ نقطہ وہ مقام ہے۔جس مقام پر اللہ تعالیٰ کی تجلی نزول کرتی ہے۔اللہ تعالیٰ کے کُن کہنے سے تجلی کی روشنی اپنی آخری حد تک پھیلی۔ یہ آخری حد میرے دل کا مقام ہے۔اس مقام پر تجلی کی روشنی نے اپنا مظاہرہ کیا۔تجلی اپنی روشنیوں کا مظاہرہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر کر رہی ہے۔ چنانچہ مخلوق کی ظاہری شکل و صورت اللہ تعالیٰ کے حکم کی صورت ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہی سیاہ نقطے کو جس صورت میں ظاہر ہونے کا حکم دیا۔سیاہ نقطہ اسی صورت میں ظاہر ہو گیا۔یعنی سیاہ نقطہ شے کا تخلیقی فارمولا ہے اور سیاہ نقطے کے اندر اس شے کی مکمل صفات اور روشنیاں موجود ہیں۔ جیسے سیب کا بیج اور اس بیج کے اندر پورا درخت بند ہے۔جب بیج اپنے اندر بند درخت کا مظاہرہ کرتا ہے تو آہستہ آہستہ درخت بیج کے اندر سے باہر آتا جاتا ہے۔جب بیج کے اندر موجود تمام روشنیاں ختم ہو جاتی ہیں۔تو درخت بھی ختم ہو جاتا ہے۔درخت کا ختم ہونا روشنی کی زمین پر حرکت کا ختم ہونا ہے۔خود روشنی کا ختم ہونا نہیں ہے۔کیونکہ بیج کے اندر کی روشنی

درخت کی روح ہے اور روح اللہ کا امر ہے۔ اللہ کی ذات حی قیوم ہے پس اللہ کی ذات کا ہر جز حی قیوم ہے اللہ کا امر بھی حی قیوم ہے۔ وہ اپنے مقام سے ذہن کی جانب نزول کرتا ہے۔ اللہ کے ارادے کے مطابق اپنا ڈسپلے کرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کے ارادے میں لوٹ جاتا ہے۔

میرے ذہن میں آیا۔ یہ سیاہ نقطہ میری اصل ذات ہے۔ جس کے اندر وہ تمام روشنیاں اور رنگ موجود ہیں۔ جن کا مظاہرہ میری ذات سے ہو رہا ہے اور آئندہ ہونے والا ہے۔ اب ذہن میں آیا۔ میری ذات کیا ہے۔ میری ذات تو کچھ بھی نہیں ہے سب کچھ تجلی ہے۔ تجلی اللہ کی ذات کا عکس ہے جو اللہ کے حکم پر مرکز دل تک پہنچتی ہے اور اس مرکز سے اپنا ڈسپلے کرتی ہے۔ سارا ڈسپلے تو تجلی کی روشنی کا ڈسپلے ہے۔ پھر میری ذات کا تذکرہ درمیان میں کہاں سے آ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری ذات محض ایک مفروضہ ہستی ہے۔ سلمان کیا۔ سلمان بس ایک فرضی نام ہے۔ جو تجلی کی روشنی نے اپنے مظاہراتی جسم کو دے دیا ہے۔ جب تک یہ مظاہراتی جسم موجود ہے سلمان نام بھی موجود ہے۔ جب یہ جسم بکھر گیا تو سلمان کی ذات بھی ختم ہو گئی۔ میرے اِندر ایک شور مچ گیا۔ جیسے میرے وجود کا ذرہ ذرہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔ لا الہ بہت دیر تک یہ تکرار میرے اندر ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ میرے یقین میں یہ بات آ گئی کہ نفی اللہ کی نہیں ہے۔ بلکہ نفی تو میری ذات کی ہے۔ لا کی ہستی تو میرا اپنا وجود ہے۔ جو محض ایک مفروضہ نام ہے اصل سلمان کیا ہے۔ تجلی کی وہ روشنی ہی تو ہے جو اس مرکز دل کے مقام پر آ کر اپنا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اگر سلمان کا نام درمیان سے نکال دیا جائے تو بس اللہ ہی رہ جاتا ہے کہ اللہ کے حکم سے اللہ کی تجلی اپنا مظاہرہ کر رہی ہے۔ دنیا میں آ کر تجلی کی آنکھ اپنے مظاہرے کو دیکھتی ہے۔ اصل ذات کو نہیں دیکھتی۔ اصل ذات تو اللہ کی تجلی ہے۔ تجلی ذات کی انا کا ایک رُخ ذاتِ باری تعالیٰ سے وابستہ ہے۔ جب انا کا فاصلہ ذات سے دور ہو جاتا ہے تو تجلی اپنی کنۂ حقیقت کو بھولتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ نزول کی انتہائی حد پر جب یہ انا اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے تو اپنی انا کو قائم رکھنے کے لئے اپنا انفرادی وجود تسلیم کر لیتی ہے۔ حالانکہ انا کی انفرادیت بھی اصل ذات کی عطا کردہ پہچان ہے۔ مگر اصل ذات سے دوری انا کے رابطے کو توڑ دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے انا کا تمام مظاہرہ انفرادی حدود میں ہوتا ہے اور یہاں سے تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انسان کی تمام برائیاں اصل ذات سے لاعلمی کا نتیجہ ہیں۔

مراقبہ ختم ہوا۔ میں نے نہایت ہی عاجزی کے ساتھ دعا مانگی۔ اے میرے رب اپنی کنۂ سے میرے رابطے کو بحال کر دے اور مجھے اصل ذات کی شناخت کے علوم عطا فرما۔ بلاشبہ اصل ذات تیرے سوا

اور کوئی نہیں ہے۔

دوسرے دن شیخ احمد سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے سوال کیا۔ ذات کی انا زمین تک آتے آتے اپنی حقیقت سے کیسے منحرف ہو جاتی ہے۔فرمایا ذات کی انا تجلی ذات کی روشنی ہے۔ جیسے سورج اور سورج کی روشنی یعنی دھوپ۔تجلی ذات کو ہم سورج کہیں تو تجلی ذات کی شعاعیں گویا دھوپ ہیں۔اللہ تعالیٰ کے کُن کہنے سے تجلی ذات کی شعاعیں کائنات کے خلاء میں بکھری ہیں۔اللہ تعالیٰ شعاع کو سماء کہتے ہیں اور جہاں شعاع آ کر ٹکراتی ہے۔اس اسکرین یا بساط کو ارض یا زمین کہا گیا ہے۔جس بھی ارض یا اسکرین سے شعاع ٹکراتی ہے اس اسکرین پر شعاع یعنی روشنی کے جذب ہونے کا (perception) عمل شروع ہو جاتا ہے۔یہی عمل تخلیق کہلاتا ہے۔تجلی ذات کے نقطے سے شعاع جب مادی زمین کی جانب نزول کرتی ہے تو بہت سے اسکرین (ارض) سے گزرتی ہوئی آتی ہے۔ہر شعاع فارمولا یا روح ہے۔روح جس بھی ارض پر آ کر ٹھہرتی ہے۔وہاں اپنا ایک جسم بنا لیتی ہے اور اپنی روشنیوں کا ڈسپلے کرتی ہے۔روح یا شعاع جس بھی ارض سے ٹکراتی ہے اس ارض کے ذرات روح کی روشنیوں کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔جیسے مٹی میں پانی ڈالا جائے تو مٹی کے ذرات پانی کو جذب کر لیتے ہیں۔روح کا ظاہری جسم اس ارض کے ذرات ہیں۔جن میں روح کی روشنیاں جذب ہیں اور باطن یعنی اصل روح ذرات کے اندر جذب شدہ روشنی ہے۔اس طرح اللہ کا امر کائنات میں کام کرتا ہے۔انسان کی روح یا امرِ ربی کی شعاع جب اپنی ذات یعنی تجلی ذات کے نقطے سے نزول کرتی ہے تو اس نزولی حالت میں اس کا گزر جنت سے ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جنت میں آدم وحوا نے نافرمانی کا ارتکاب کیا اور اس کی پاداش میں دنیا میں بھیج دیئے گئے۔پس ہر انسان جو اس دنیا میں آتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ان سے جنت میں کوئی نہ کوئی غلطی ایسی سرزد ہو جاتی ہے۔جس کی سزا میں وہ دنیا میں بھیج دیئے جاتے ہیں۔غلطی کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے جو رابطہ ذات باری تعالیٰ سے روح کا تھا۔وہ رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔جس کی وجہ سے روح اپنی ذاتی انا کو برقرار رکھنے کے لئے انفرادی انا کی تخلیق کرتی ہے۔یہی ذیلی انا انسان یا آدم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ احسن الخالقین ہے۔یعنی خالقین میں سب سے اچھا تخلیق کرنے والا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا بھی اور خالقین ہیں۔پس ان ذیلی خالقین میں ایک نام روح کا بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علوم وصلاحیتوں کے ذریعے اپنا جسم تخلیق کرتی ہے اور پھر

دنیا میں اس جسم کے ساتھ رہ کروہ رابطہ بحال کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ جو رابطہ دنیا میں آنے سے ٹوٹ گیا تھا۔اس رابطے کو قرآن میں صلواۃ کہا ہے اور جن اصولوں پر صلواۃ قائم کی جاتی ہے وہ اصول عبادت کہلاتے ہیں۔ چونکہ صلواۃ یا رابطہ اللہ تعالیٰ کی ہستی سے ہے جو لامحدود ہے پس قائم الصلواۃ کے اصول یا عبادت کے طریقے بھی لامحدود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو قائم الصلواۃ کے مختلف اصول بتائے۔ یہی اصول شریعت کہلاتے ہیں۔ دنیا میں آنے کے بعد چونکہ روح یا امرِ ربی کا رابطہ خالق کی ذات سے ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہنہ حقیقت یا اصل ذات سے منحرف ہو جاتی ہے۔اس کے بعد میں نے پیر و مرشد سے درخواست کی کہ میرے لئے دعا کریں کہ میں اپنی حقیقت سے رابطہ بحال کرلوں اور کبھی بھی اس حقیقت سے انحراف کرنے کا خیال دل میں نہ لاؤں۔ شیخ احمد نے مجھے دم کیا اور بہت محبت کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔ مجھے محسوس ہوا۔ دن بدن پیر و مرشد سے زیادہ محبت کر رہا ہوں۔ لیکن نہیں ان کی چاہت میری محبت سے زیادہ ہے۔اس خیال نے مجھے ایک سرور میں ڈبو دیا۔ جہاں خوشی، سکون اور تحفظ تھا۔

میرے مراقبے جاری تھے۔ کبھی کبھی درود و شہود کی کیفیات ایسی ہو جاتیں کہ شیخ کی ہستی میں مجھے ساری کائنات دکھائی دیتی۔ ایسی حالت میں میرا جی چاہتا میں زیادہ سے زیادہ شیخ کے قریب رہوں۔ان کے اشارے پر بجلی کی طرح کام کروں۔ جتنی دیر محفل میں ہوتا میری نظریں شیخ کی صورت سے ہٹنا بھول جاتیں۔ان دنوں شیخ کے التفات بھی مجھ پر زیادہ تھے۔

حد سے نہ گزر جانا شوقِ دل

دیوانہ

دل شیشے کا شیشہ ہے پیمانے کا

پیمانہ

اس راستے پر بندہ اللہ تعالیٰ کے عشق کے انوار میں ڈبو دیا جاتا ہے۔ بھلا عشقِ حقیقی کے دریا میں غوطہ لگانے کے بعد دنیا کی بے ثباتی کسے متاثر کرسکتی ہے۔ عشقِ الٰہی اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے۔ جو تجلی کے حواس ہیں۔ روحانی راستے پر جب سالک مرشد کی رہنمائی میں اللہ تعالیٰ کی جانب قدم بڑھاتا ہے تو مرشد کی ذات کی تجلی اس کے بشری حواس پر غالب آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مرشد کے لئے اپنے دل میں محبت محسوس کرتا ہے۔ میرا تو یہ عالم تھا کہ اندر باہر جہاں بھی نظر پڑتی تھی۔ شیخ کی صورت دکھائی

دیتی تھی ۔میری انا شیخ کی انا کے سمندر میں ڈوب چکی تھی ۔میرے قلب کی آنکھ ہر وقت دیکھتی کہ میرا پورا وجود شیخ کے وجود میں سمایا ہوا ہے ۔اور آہستہ آہستہ شیخ کے وجود کے اندر میرا وجود بڑھ رہا ہے۔جس طرح ماں کے رحم میں بچہ نشو ونما پاتا ہے ۔جس طرح ایک کمسن بچے کے لئے اس کی ماں کی حیثیت پوری خدائی سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے ۔اسی طرح میرے لئے بھی شیخ کی ہستی ساری خدائی سے کم نہ تھی ۔ان کے قریب بیٹھنے، ان کے پاؤں چومنے اور ان سے گلے لگ کر مجھے ایسا سکون ملتا تھا ۔

اب گھر میں اکثر روحانیت کی باتیں ہوتیں ۔کبھی گھر والے کسی روحانی نکتے پر استفسار کرتے ۔ تو ذہن میں ایسے ایسے دلائل آتے کہ میں خود حیران رہ جاتا کہ اس سے پہلے یہ بات کہاں تھی ۔ پاپا تو بہت خوش تھے ۔می بھی اب مطمئن تھیں ۔ اکثر کہا کرتیں میرا بیٹا ماشاءاللہ بہت جینئس ہے ۔ میں پہلے بھی خاصا خوش باش آدمی تھا اب تو میری روح بھی ہر وقت مسکراتی محسوس ہوتی ۔بس میری ایک ہی دکھتی رگ تھی ،نزیما ۔اب بھی میرا ذہن اس کے پرایا ہو جانے کو کسی طرح قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔مگر اب میرا ذہن پورا پورا روحانی طرزِ فکر پر چلنے لگا تھا۔جس کی وجہ سے میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا ۔ان دنوں سیماں پھوپھی کی جانب سے نزیما کی شادی کا کارڈ آیا۔شادی اگلے ماہ ہونے والی تھی ۔ابھی پورے چار ہفتے تین دن تھے ۔میرے زخم پھر ہرے ہو گئے ۔ پتہ نہیں کیوں دل یہ کہہ رہا تھا محبت تو ایک ہی ہستی سے ہوتی ہے ۔محبوب تو ایک ہی ہوتا ہے ۔نزیما کی نگاہوں میں تمہارے لئے محبوبیت کا پیام تھا ۔ تمہاری بے رُخی نے اسے ماں باپ کے آگے سر جھکانے پر مجبور کر دیا ۔ایک بار پتہ تو کرو کیا وہ اس رشتے سے خوش ہے ۔ دو دن تک یہی خیال ذہن میں پیوست رہا۔تیسرے دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ نزیما کو شادی کی مبارکباد دینے کے بہانے اس سے بات کروں ۔ رات کو میں نے اسے فون کیا۔ساتھ ساتھ یہ بھی دعا تھی کہ نزیما ہی فون اُٹھائے ۔اللہ بہت مہربان ہے دوسری جانب سے نزیما کی آواز سن کر اطمینان ہوا۔دراصل مجھے اس بات کی شرمندگی تھی کہ جب میں نے پہلے اس سلسلے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی تو اب جبکہ شادی کے سارے انتظامات ہو چکے ہیں کوئی شوشہ چھوڑنا اچھا نہیں ہے ۔اس سے خاندان میں نا چاقی ہو جائے گی ۔ یہی وجہ ہے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے گھر والے یا نزیما کے گھر والوں کو پتہ لگے ۔ پہلے میں نزیما سے براہِ راست بات کرنا چاہتا تھا۔اگر وہ تیار ہو تو پھر خاندان کا اتنا مسئلہ نہیں تھا ۔ میں نے اسے شادی کی مبارکباد دی ۔اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا ۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے ۔

پھر میں نے پوچھا تم خوش تو ہونا۔اس نے فوراً جواب دیا آپ کو میری خوشی سے کیا سروکار۔ میں نے کہا۔ ہے جبھی تو پوچھ رہا ہوں۔وہ بولی جبھی تو انکار کر دیا تھا۔میں نے کہا میں نے انکار تو نہیں کیا تھا۔صرف کچھ عرصہ انتظار کرنے کو کہا تھا۔مجھے یقین تھا کہ تم میرا انتظار کروگی۔وہ بولی مگر میں تو یہی سمجھی تھی کہ تم نے انکار کر دیا ہے۔امی نے مجھے کچھ ایسا ہی تاثر دیا تھا۔میں نے کہا۔اصل میں مجھ سے ہی غلطی ہوگئی۔میں نے شادی کے متعلق بات کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔اسی خوش فہمی میں رہا کہ میری جنت مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔یہ سن کر شاید وہ رو پڑی۔تھوڑی دیر تک سکوت رہا پھر اچھا خدا حافظ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

میری آنکھوں سے نیند اُڑ گئی۔میں سوچنے لگا۔ابھی تو ایک مہینہ باقی ہے۔شادی روک دینی چاہیئے۔ساری رات انہی تدبیروں میں گزر گئی۔صبح صبح میں نے سوچ لیا کہ دفتر جاتے وقت ذرا پہلے نکلوں گا اور حضور سے سارا معاملہ بتا کر مشورہ لوں گا۔مجھے اطمینان ہوا۔آدھا گھنٹہ میں نیند آ گئی۔صبح نہا دھو کر ذرا فریش ہو کر مرشد کریم کے پاس گیا۔وہ اس بے وقت مجھے دیکھ کر حیران ہوئے اور فوراً اندر بٹھایا۔سلمان بیٹے خیریت تو ہے۔میں نے رات کا سارا واقعہ من وعن سنا دیا اور ان کے گھٹنوں میں سر چھپا کر بے چارگی سے کہا۔مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کیا کروں۔وہ مسکرائے میرے سر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور فرمانے لگے۔بس چپ چاپ بیٹھے تماشہ دیکھتے رہو۔سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔انشاءاللہ۔ مجھے بڑی ڈھارس بندھی۔میں دفتر آ گیا۔

شام کو گھر پہنچا تو راحیلہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ایک دم بول پڑی۔ارے کچھ سنا ہے مجنوں صاحب آپ نے، آپ کی لیلیٰ نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔میرا دل زور سے دھڑک اُٹھا۔بے ساختگی میں میں نے اس کے بال پکڑ لئے۔شریر کہیں کی سچ سچ بتا کیا ہوا۔اس نے بڑے ڈرامیٹک انداز میں سنایا کہ پھوپھی سیماں کا فون آپ کے پاپا کو آیا تھا۔کہنے لگیں ہائے بھائی جان اس لڑکی کی تو مت ماری گئی ہے۔کارڈ بٹ گئے، ہال بک ہو گیا۔اب کہتی ہے۔میں نے یہ شادی نہیں کرنی ہے۔میری شادی ہوگی تو سلمان سے ہوگی۔میرے تو پاؤں سے زمین گم ہے۔کیا کروں کیا نہ کروں۔میں نے جلدی سے کہا۔پھر پاپا نے کیا جواب دیا۔کہنے لگی۔انکل بولے تم فکر نہ کرو۔میں تمہاری بھابھی سے مشورہ کر کے جواب دیتا ہوں۔اتنے میں آواز سن کر ممی پاپا بھی آ گئے۔کہنے لگے۔معلوم ہوتا ہے یہ سارا ہنگامہ تمہارا برپا کیا ہوا ہے۔میں نے خوشی سے ہنستے ہوئے کہا پاپا مجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں۔میں تو ابھی آیا

ہوں ممی بولیں جبھی تو ہنس رہے ہو۔ پاپا بولے ۔ بھئی! باجی بہت پریشان ہیں ۔تم بچوں کی باتیں انہیں تو سمجھ میں آتی نہیں ہم سب کھانے کی میز پر بیٹھ گئے ۔ طے یہ پایا کہ شادی کی جو تیاری ہے ۔شادی اُسی تاریخ پر ہو۔مگر جیسا کہ بچے چاہتے ہیں زیما اور سلمان کی ہو جائے ۔اب رہ گیا مسئلہ زیما کے منگیتر کا تو پاپا اور چاچا دونوں ان لوگوں سے بات کر کے انھیں سمجھا دیں ۔تو ایسا لگ رہا تھا جیسا میں خواب دیکھ رہا ہوں ۔بار بار خیال آتا پیرو مرشد کی دعا قبول ہوگئی ۔

شام کو کام سے سیدھا میں شیخ کے پاس پہنچا انھیں تمام صورتحال سے آگاہ کیا ۔ان کا شکر یہ ادا کیا ۔مزید دعا جاری رکھنے کی گزارش کی تا کہ حالات معمول پر آجائیں اور گھر آ گیا ۔ پاپا اور چاچا دو دن بعد واپس آگئے کہنے لگے وہ لوگ نہایت ہی معقول نکلے ۔سب سے پہلے ہم نے لڑکے کو گھر بلا کر اس سے ساری سچویشن پر بات کر لی ۔وہ کہنے لگا ۔ میں زبر دستی کی شادی کا قائل نہیں ہوں ۔ مذہب بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا ۔مگر امی اور ڈیڈی کو اس بات کا بہت صدمہ ہو گا ۔بہتر یہ ہے کہ میں خود اس معاملے کو ان تک پہنچاؤں ۔ بیچ میں میں بڑوں کو نہ لاؤں ۔بہر حال اس نے کسی طرح اس معاملے کو اپنے والدین کے سامنے پیش کر دیا اور خود ان کی طرف سے پیغام آ گیا کہ یہ شادی روک دی جائے ۔ میرا خیال فوراً شیخ کی طرف گیا اور میں سوچنے لگا کہ مرشد کا ارادہ مرید کے معاملات میں کس طرح کام کرتا ہے ۔مرید کو مرشد کی ذات سے کتنا تحفظ حاصل ہوتا ہے ۔ مجھے یقین ہو گیا ۔شیخ احمد اس رشتے سے بہت خوش ہیں ۔اب گھر میں پھر سے ایک بار شادی کی گہما گہمی شروع ہو گئی ۔گھر کی ساری خواتین حرکت میں آگئیں ۔ادھر اس رشتے سے سارے خاندان والے بھی خوش ہو گئے ۔ کیونکہ زیما کے لئے خاندان میں بس ایک میں ہی اس کی عمر کا تھا ۔اسی وجہ سے اس کی شادی غیروں میں ہو رہی تھی ۔لوگ زیادہ تر اپنے خاندان میں رشتے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں ۔بہر حال مجھے اس بات کی سب سے زیادہ کوشی تھی کہ زیما کے دل میں بھی وہی جگہ ہے جو میرے دل میں اس کی ہے ۔

شادی کے لئے میں نے دفتر سے پندرہ دن کی چھٹی لے لی ۔اسی دوران ولیمہ بھی ہونا تھا ۔ بارات کراچی سے پنڈی گئی ۔ چند لوگ ہوائی جہاز میں گئے باقی ریل گاڑی میں ساری بارات گئی ۔ شادی کے بعد تیسرے دن ہم کراچی روانہ ہوئے ۔ ولیمہ ساتویں دن تھا ۔ ولیمے سے ایک دن پہلے پنڈی سے سارے رشتہ دار اور زیما کے گھر والے آگئے ۔ عجیب رنگین ماحول تھا ۔خوشیوں سے بھری فضا میں ہماری روحیں بھی خوشی میں جھوم رہی تھیں ۔پیرو مرشد کی دعائیں رحمت بن کر ہمارے اوپر محیط تھیں

۔زیما سے ملنے کے بعد میرا دل اور بھی زیادہ شیخ کی محبت اور تشکر کے جذبات سے لبریز ہو گیا تھا۔ جب بھی زیما کی جانب دیکھتا۔ شیخ کی دعائیں یاد آجاتیں اور میں اللہ کا شکرادا کرتا جس نے مجھے میرے شیخ سے ملایا اور شیخ کے زریعے زیما سے ملایا۔

زیما گھر کی لڑکی تھی۔ اسے گھر کے ماحول میں ایڈجسٹ ہوتے کچھ دیر نہ لگی۔ گھر کا ہر فرد اس پر جان دیتا تھا اور پھر سب سے بڑی چیز تو میاں بیوی کی ذہنی ہم آہنگی ہے۔ ازدواجی زندگی کی سب سے بڑی خوشی میاں بیوی میں آپس کی محبت ہے۔ گھر کے سب افراد شیخ کے حضور حاضر باش ہو گئے۔ سب کے ساتھ زیما بھی پہلی بار وہاں گئی۔ شیخ احمد کا چہرہ خوشی سے چمک گیا۔ اس دن پیر و مرشد نے بہت اچھی اچھی باتیں بتائیں۔ کچھ اپنے شروع دور کی باتیں کہ کن کن مراحل سے گزر کر روحانیت میں قدم رکھا۔ مجھے ان کی باتین سن کر یوں لگا جیسے زیما کی تربیت کا پہلا سبق ہے۔ چند روز بعد زیما نے بھی شیخ احمد سے بیعت کر لی۔ اب ہم دونوں آزادی کے ساتھ روحانیت پر بات چیت کرتے اور خوشی خوشی ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیال کرتے۔ اگر ذہنی ہم آہنگی ہو تو دو دماغ مل کر ایک بڑی طاقت بن جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے اب ہوا۔ اب قرآن کے چھپے ہوئے اسرار و حکمتیں بہت جلد ذہن میں آ جاتیں۔

زیما کا جی چاہتا کہ وہ بھی ریاضتیں کرے مگر شیخ احمد نے کہا۔۔۔۔۔۔ ابھی نہیں! ہر کام اپنے وقت پر اچھا لگتا ہے۔ ابھی تمہاری ریاضت یہ ہے کہ باترجمہ قرآن پڑھا کرو اور تمہاری سب سے بڑی ریاضت امورِ خانہ داری ہے اور گھر والوں کی خدمت ہے۔ عورت کے لئے مرد سے ہٹ کر مجاہدہ کا پروگرام ہے۔ کیونکہ عورت گھر سے باہر نہیں رہ سکتی۔ اس کے اوپر گھر کے کام کاج کی بھی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں میں ان کے لئے مجاہدہ ہے۔ جیسے حضرت بی بی فاطمہؓ گھر کے کام کاج کرتی تھیں۔ چکی پیستی تھین۔ مشکیزہ بھر کر کنوئیں سے پانی لاتی تھیں۔ چکی پیستے پیستے ان کے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ ایک بار کسی نے انھیں اطلاع دی کہ مالِ غنیمت میں کچھ کنیزیں آئی ہیں۔ اپنے گھر کے کام کاج کے لئے آپ بھی حضور پاک ﷺ سے ایک کنیز مانگ لیں۔ آپ نے حضور پاک ﷺ سے کہلوا بھیجا کہ ایک کنیز مجھے بھی عنایت کر دیں تو مجھے گھر کے کاموں میں کچھ فراغت ہو جائے۔ یہ سن کر حضور پاک ﷺ آپؓ کے گھر آئے اور فرمایا۔ بیٹی تمہارے لئے کنیز سے بہتر یہ اسماء ہیں۔ تم ہر نماز کے بعد انھیں پڑھ لیا کرو۔ سبحان اللہ تینتیس بار، الحمد للہ تینتیس بار اور اللہ اکبر چونتیس بار۔ اسی لئے اس تسبیح کو

تسبیح فاطمہؓ کہتے ہیں۔حضور پاک ﷺ کے ذہن میں اپنی بیٹی کی روحانی تربیت تھی اور روحانی تربیت کے لئے مجاہدوں کی ضرورت ہے۔ایسے مجاہدے جن سے نفس اپنی خواہشات سے کمزور پڑ جائے۔

پیرومرشد نے فرمایا بیٹا جب تک نفس مغلوب نہ ہو روح قوت نہیں پکڑتی۔جیسے صبح کے ہلکے اجالے میں چاند دکھائی دیتا ہے۔مگر جب دھوپ تیز ہو جاتی ہے تو چاند غائب ہو جاتا ہے۔نفس خواہشات کی آماجگاہ ہے۔وہ دنیاوی عیش و آرام چاہتا ہے۔دنیاوی اقتدار و عزت چاہتا ہے۔جب نفس کو ان خواہشات سے روک کر اعتدال میں رکھا جاتا ہے تو نفس مغلوب پڑ جاتا ہے۔جب دنیاوی نفس مغلوب ہو جاتا ہے تو روح اپنے ارادے سے اس سے کام لیتی ہے، اس طرح روح کا ارادہ غالب آجاتا ہے۔روح امرِ ربی ہے۔روح کے اندر اللہ کا امر کام کر رہا ہے۔پس نفس کی حرکت مغلوب ہونے سے اللہ تعالیٰ کے امر کی حرکت پر نفس حرکت کرتا ہے۔اور آدمی کے اعمال و افعال اللہ تعالیٰ کے ارادے کے مطابق ہو جاتے ہیں۔فرمانے لگے۔پہلے زمانے میں روحانی استاد اپنے طالب علموں کو نفس پر کنٹرول کرنے کے لئے بڑے بڑے مجاہدے کراتے تھے۔جیسے کنوئیں میں الٹا لٹکانا، دریا میں کھڑا کرانا، درخت سے لٹکانا، ننگے پیر چلانا، جنگلوں میں کافی عرصے کے لئے بھیج دینا، کشکول ہاتھ میں دے کر بھیک منگوانا، ٹاٹ کے کپڑے اور روکھی سوکھی غذا کا استعمال کرانا۔یہ سارے مجاہدے نفس پر کنٹرول پانے کے لئے ہوتے تھے۔وہ بھی ایک دور تھا۔یہ بھی ایک دور ہے۔ہر دور میں نفس انسانی کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔آج کا دور نوعِ انسانی کا ارتقائی دور ہے۔چونکہ نوع انسانی کا ارتقاء انسان کے اندر کام کرنے والی فطرت کے عین مطابق ہے اور فطرت اسمائے الٰہیہ کی صفات ہیں۔اس وجہ سے آج کے دور میں نفس کو کنٹرول کرنے کے لئے مجاہدے بھی اس دور کے تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں۔انسانی نفس کی یہ فطرت ہے کہ وہ یکسانیت سے گھبرا جاتا ہے۔آج کے دور میں نفس کو اپنے تقاضے پورے کرنے کے لئے کچھ زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔اس کے عیش و آرام کے بے پناہ سامان سامنے آچکے ہیں۔آج کے دور کا انسان اگر روحانیت کی طرف مائل ہوتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔جس کی وجہ سے نفسانی تقاضوں میں اس کے لئے دلچسپی باقی نہیں رہتی یا کم ہو جاتی ہے۔وہ اس بات سے پہلے ہی واقف ہو جاتا ہے کہ محض نفسانی خواہشات کی تکمیل آدمی کو روحانی سکون اور دلی تسکین نہیں پہنچا سکتی۔بلکہ روحانی سکون حاصل کرنے کا کوئی اور راستہ ہے۔تب اس کے دل میں اس راستے کی تلاش و جستجو پیدا ہوتی ہے۔

شیخ احمد اپنے مشن کے کاموں سے اکثر باہر کے ممالک میں بھی جاتے تھے۔ گو بہت عرصے سے باہر ان کا جانا نہیں ہوا تھا۔ مگر ان دنوں ان کا ساؤتھ افریقہ جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ ایک ماہ کا دورہ تھا۔ ہم سب کو خصوصاً مجھے شیخ احمد کی اتنی عادت پڑ چکی تھی کہ جدائی کے تصور سے ذہن سوچ میں پڑ جاتا کہ یہ مدت کیسے گزرے گی میں تو تقریباً روزانہ ہی وہاں جاتا تھا۔ بہر حال وہ دن بھی آ ہی گیا جب وہ ہم سے رخصت ہو کر ایک ماہ کے دورے پر چل دیئے۔ چلنے سے پہلے شیخ احمد نے مجھے یہ کہا کہ میری غیر موجودگی میں تم میرے نائب کی حیثیت سے کام کرو گے۔ جب مراقبہ کرو تو اجتماعی مراقبہ تصور شیخ کا کرانا اور خود تم یہ تصور کرنا کہ تمہارے اندر شیخ کی روشنیاں موجود ہیں اور یہ روشنیاں تمہارے قلب سے نکل کر لوگوں کے قلب میں داخل ہو رہی ہیں۔ اس طرح تمہارے ذریعے سے شیخ کا تصرف تمام لوگوں پر ہو گا۔ پہلے ہی دن جب میں نے یہ مراقبہ کرایا تو مجھے یوں لگا کہ شیخ میرے اندر اس طرح موجود ہیں کہ میرے ہاتھ کے اندر ان کا ہاتھ میرے جسم کے اندر ان کا جسم اور پاؤں کے اندر ان کے پاؤں ہیں۔ میری ذات ان کے جسم کے اوپر ایک لباس کی حیثیت سے تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میری ذات محض ایک خول ہے۔ اس خول میں ساری روشنیاں شیخ کی ہیں۔ میری ساری توجہ شیخ کی جانب چلی جاتی۔ اب جب بھی میں مراقبہ کرتا۔ تنہائی میں یا اجتماعی مجھے اپنی ذات سوائے خول کے کچھ دکھائی نہ دیتی۔ اپنے اندر شیخ کی روشنیوں کا دریا بہتا دکھائی دیتا۔ اوپر سے تو اپنی ذات اسی طرح مختصر نظر آتی۔ مگر جب باطن پر شیخ کی روشنیوں پر پڑتی تو یہ عالم دکھائی دیتا۔ آہستہ آہستہ یہ عالم پوری کائنات جتنا وسیع ہو گیا اور اسی وسعت کے ساتھ ساتھ شیخ سے میری محبت بھی بڑھتی گئی۔

ان دنوں ثریا پنڈی اپنی امی کے پاس چند ہفتوں کے لئے گئی تھی۔ میں کام سے آ کر زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتا۔ خصوصاً رات کے کھانے کے بعد تو میرا جی صرف مطالعے کے لئے چاہتا اور کسی کام کی رغبت نہ ہوتی یا پھر رات کو سوتے وقت مراقبہ کرتا۔ دو ہفتے اسی طرح گزر گئے۔ اب چوبیس گھنٹے شیخ کا تصور دل دماغ پر چھایا رہتا۔ کبھی کبھی تنہائی میں یہ حالت ہو جاتی جیسے شیخ میرے پاس بھی موجود ہیں۔ مجھے اپنے اوپر ایک سایہ سا مسلط دکھائی دیتا اور یہی احساس ہوتا کہ یہ میرے شیخ ہیں۔ اپنے اندر نظر پڑتی تو ان کی روشنیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ جی چاہتا کہ کسی طرح ان کو دیکھ لوں انہیں چھو لوں۔ مجھے یوں لگتا جیسے شیخ ہی میری کائنات ہیں۔ ان سے بچھڑ کر میری موت واقع ہو جائے گی۔ شیخ کی محبت تمام محبتوں پر غالب آ گئی تھی۔ میں گھبرا کے یہی دعا کرتا تھا کہ اے

میرے رب شیخ کو مجھ سے نہ چھیننا۔میرا وجود ان کے بغیر کچھ نہیں ہے۔اپنے اندر باہر ان کی روشنیوں کو محیط دیکھتا اور محسوس کرتا۔دفتر میں تو ذہن مصروف ہونے کی وجہ سے احساس اتنا گہرا نہ ہوتا مگر گھر پر یہ احساس اس قدر گہرا ہو جاتا کہ ان کی موجودگی کا یقین ہو جاتا۔جیسے میری آنکھیں کسی گہرے چشمے سے ان کو دیکھ رہی ہیں یا اندھیرے میں دیکھ رہی ہیں۔چونکہ نظر کو صاف اور روشن نظر نہیں آتا اس وجہ سے روح کا تقاضہ بڑھتا جاتا ہے۔جیسے جیسے قرب کا تقاضہ بڑھتا جاتا ہے۔ ویسے ویسے عشق جڑ پکڑتا جاتا ہے۔کبھی مجھے یوں لگتا جیسے مرشد کا عشق ایک درخت ہے۔جو میرے دل کی زمین پر بویا گیا ہے۔میرا دل ساری کائنات ہے۔مرشد کے عشق کا درخت میری کائنات میں پھیلتا جا رہا ہے مجھے اس کا پھیلاؤ دکھائی دیتا۔جیسے یہ پھیلاؤ زمین سے آسمان تک ہے۔تحت الثریٰ سے عرشِ معلیٰ تک ہے۔میرے جسم سے میری جان تک ہے۔میرے ذہن میں اللہ کا کلام گونجتا.........

ترجمہ:

"کلمۂ طیبہ ایک پاکیزہ درخت کی
مانند ہے جس کی جڑیں بڑی
مضبوط ہیں اور شاخیں آسمان تک
پہنچی ہوئی ہیں۔وہ دے رہا ہے
اپنا پھل ہر وقت اپنے رب کے حکم
سے"۔(سورۃ ابراہیم ۲۴)

میں سوچتا مرشد کی فکر کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔جو میری ذات کی کائنات میں ازل سے ابد تک۔مشرق سے مغرب تک۔شمال سے جنوب تک پھیلا ہوا ہے اور ہر وقت پھل دے رہا ہے۔اس کا پھل اس فکر کے علوم ہیں۔فکر جب طیب یعنی پاک ہوتی ہے تو لامحدودیت کو پالیتی ہے۔پاکی اللہ تعالیٰ کی سبحانیت ہے۔سبحانیت لامحدودیت ہے پس پاک فکر کا بیج لامحدودیت کی زمین میں بویا جاتا ہے اور لامحدودیت اللہ کا نور ہے۔پس اس بیج کے پھلنے پھولنے میں نور اور اس کی نگہداشت کرنے سے اچھا پھل آتا ہے اسی طرح اچھی فکر بھی انسان کے اندر روح کی توانائی پیدا کرتی ہے جبکہ غلط انسان کے اندر خراب روشنیاں یا ایسی توانائی بھر دیتی ہے جو انسان کی ذات کو نقصان پہنچاتی ہے۔مجھے محسوس ہوا مرشد میری روح کی توانائی ہے۔تنہائی میں مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے مرشد میری ذات سے اس قدر

قریب ہے کہ اس کی سانسیں میری سانسوں میں داخل ہو رہی ہیں ۔ یہ ایک سرکل چل رہا ہے ۔ میں سوچتا ۔میری ہر سانس مرشد کی بخشش ہے ۔ وہ سخی ہے ۔ میں اس کی عطا کا محتاج ہوں ۔ میری حیات ، میری ممات ، میرا ایثار سب کچھ مرشد کے لئے ہے ۔ میرے ذہن میں قرآن کی یہ آیت ابھرتی ۔

ترجمہ:

'' بیشک میری نماز اور میری
قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا
اللہ کے لئے ہے جو رب ہے،
سارے جہانوں کا''۔ (سورۃ
انعام ۱۶۲)

آج مجھے محسوس ہوا بندگی کے راستے پر مرشد کی ذات وہ پہلا دروازہ ہے جو اس عالم میں کھلتا ہے ۔ میرا جی چاہا میں اس در کی چوکھٹ بن جاؤں کہ مرشد کے قدم ہر بار اس چوکھٹ سے گزرتے رہیں ۔ آج میرا عشق مجھے اس مقام پر لے آیا ہے جہاں ساری کائنات کی محبتیں مرشد کے نقطے میں جذب ہوگئی ہیں ۔ زریما کی محبت ۔ دادی اماں کی محبت ، ماں کی محبت ، باپ کی محبت ، بہن کی محبت میرے ذہن میں تیزی سے سارے خاندان کے ہر ہر فرد آتے رہے ۔ یوں لگتا جیسے تمام افراد میرے سازِ محبت کے بکھرے تار ہیں ۔ سازِ محبت میرا دل ہے اور یہ سارے تار دل کے مرکز میں آکر ایک جگہ پیوست ہو گئے ہیں ۔ اب اس مرکز دل سے نغمے جاری ہیں ۔ دل کے ہر نغمے کا محور مرشد کی ذات ہے ۔ مرشد میرا دل ہے ، میری جان ہے ، جس کی دھڑکن میرا نغمہ حیات ہے ۔ میرا دل کہہ اُٹھا ۔

محبت کے لئے کچھ خاص دل
مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں
جاتا

ذہن و دل کی اس تمام وابستگی کے باوجود میں برابر دفتر بھی جا رہا تھا ۔ گھر کے بھی سب کام درست ہو رہے تھے ۔ البتہ ہر بات جب منہ سے الفاظ بن کر نکلتی تو یوں لگتا جیسے یہ الفاظ بڑی گہرائی سے نکل رہے ہیں اور ان الفاظ میں وزن تھا کہ انہیں سننے والا متاثر ہوتا تھا ۔ شیخ احمد کو گئے ہوئے تین ہفتے

گزر گئے۔ایک دن شام کوخیال آیا نہ جانے مرشد کومیری اس حالت کی خبر ہے یانہیں۔دراصل عشق جب اپنی انتہا کوپہنچ جاتا ہےتو محبوب سے قربت چاہتا ہے۔عشق کی معراج وصال ہے۔یعنی عشق ذات کی کشش ہے۔یہ کشش عشق بن کر ذات سے قریب کرتی رہتی ہے۔جب عاشق اپنے محبوب سے قریب تر پہنچ جاتا ہےتو اسے اس منزل کو چھو لینے کی خواہش ہوتی ہے۔مرکز تخیل کوتمام حواس کا چھولینا ہی معراج ہے۔روح کی تڑپ نے جسمانی حواس کومرتعش کردیا۔کون جانتا ہے مرشد کومیرے حال کی خبر ہے یانہیں۔اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔آواز آئی۔سلمان بیٹے ٹھیک تو ہونا۔میں تمہارے ہر حال سے باخبر ہوں۔میری توجہ ہردم تمہاری جانب ہے۔بہت جلد آنے والا ہوں۔میری زبان گنگ ہوگئی۔قوت سماعت کے ذریعے مرشد کے الفاظ کی لہریں میرے ناتواں حواس کوتقویت پہنچانے لگیں۔میں نے آہستہ آہستہ گہری سانسیں لیں۔جیسے مردہ جسم میں زندگی آگئی ہو۔بڑی مشکل سے صرف اتنا کہہ سکا۔بس آپ جلدی آجایئے۔آپ کی بے حد یاد آتی ہے۔روح کی آواز خاموشی کی زبان میں اندر اندر کہہ رہی تھی۔

ابر باراں ذرا اک قطرہ شبنم
دے دے
دل جلا جاتا ہےتو دیدہ پرنم
دے دے
رحمتیں آج مرے درد کا درماں بن
جائیں
دل کے ہر زخم کو دیدار کا مرہم
دے دے

دوسرے دن شام کومیں اپنی اس حالت پرغور کرنے لگا کہ روحانیت کے راستے پرمحبت اور عشق کا اتنا دخل کیوں ہے۔میرا ذہن بچپن کے دور میں جھانکنے لگا۔اس پورے دور میں مجھے دادی اماں کی ذات وہ ہستی نظر آئیں جن کے ساتھ میری ذہنی اور قلبی وابستگی اسی انداز میں رہی جیسی آج مرشد کے ساتھ ہے۔میں نے سوچا بچے کی تو ہرحرکت فطری تقاضے کے زیر اثر ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ چاہے جانے کا تقاضہ اور چاہنے کا دونوں تقاضے انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔مجھے محسوس ہوا کہ انسان اپنی

زندگی کی عمارت اسی بنیاد پر کھڑی کرتا ہے۔وہ چاہے جانے کا اور چاہنے کا تقاضہ تمام عمر پورا کرتا رہتا ہے۔مگر اس تقاضے کی تکمیل کے دو رخ ہیں۔ایک رخ میں اس کی محبت کا محور اللہ کی ذات ہوتی ہے۔جہاں اللہ کی ذات مرکزیت بن جاتی ہے وہاں حواس لامحدودیت کو محسوس کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حواس کی ہر کیفیت شدید اور گہری ہو جاتی ہے۔

چار پانچ دنوں میں زیما بھی آ گئی اور اس کے دو دن بعد شیخ احمد بھی آ گئے۔اب میرا دل شدت سے یہ چاہنے لگا کہ میں تنہائی میں انھیں اپنی کیفیت سے آگاہ کروں۔مجھے یوں لگتا تھا کہ مجھے اپنی کیفیات اور مرشد کے ساتھ اس حد تک وابستگی کے متعلق کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہیئے۔کیونکہ ہر شخص حواس کی اس گہرائی سے واقف نہیں ہے۔جس کی بناء پر وہ اسے صحیح معنی نہیں پہنا سکتا۔صرف مرشد کی ذات اس گہرائی کو جانتی ہے۔میرے ذہن میں دریا میں ڈوبنے کا تصور آ گیا۔جب دادی اماں رنگین دریا میں ڈوبنے کا ذکر کرتی تھیں۔میں سوچنے لگا میں مرشد کی ذات کے دریا میں تہہ تک ڈوب چکا ہوں۔جس طرح پانی کے اندر ڈوبنے سے حواس پر دباؤ پڑتا ہے۔اسی طرح ذات کی مرکزیت میں فنا ہونے سے بھی غالب آنے والی ہستی کے دباؤ کو محسوس کیا جاتا ہے۔

دوسرے دن رات کو میں شیخ احمد کے پاس گیا۔وہ تنہا تھے۔میں نے جاتے ہی ان کے قدم چوم لیے۔یہ سب کچھ ایک والہانہ جذبہ تھا۔میں ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ہو کہتے رہے کہ صوفے پر بیٹھ جاؤ۔مگر میں نے ان کے گھٹنوں پر اپنا سر ٹیک دیا۔بابا جی مجھے یہیں رہنے دیں۔پھر میں نے آہستہ آہستہ اپنی ساری کیفیت انھیں بتائی۔میرے مرشد! مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری ذات آپ کی ذات میں فنا ہو رہی ہے۔ان کے چہرے پر خوشی کی جھلکیاں تھیں۔بولے۔بیٹے روحانیت میں یہ منزل بڑی اہمیت رکھتی ہے۔فنا فی الشیخ کے درجے میں مرید جو کچھ محسوس کرتا ہے وہ تم جان چکے ہو۔مگر اس کی علمی توجیہہ ابھی تمہارا ذہن نہیں سمجھ پایا ہے۔بیٹے، انسان کا دل ایک آئینہ ہے۔اس آئینے میں لوحِ محفوظ کے نوری تمثلات عکس ریز ہوتے رہتے ہیں۔فنا فی الشیخ کے درجے میں مرید کا آئینہ مرشد کے دل کے آئینے کے مقابل آ جاتا ہے۔نگاہ کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی سیدھ میں دیکھتی ہے۔یعنی سامنے دیکھتی ہے۔جب مرید کے دل کا آئینہ مرشد کے دل کے مقابل آ جاتا ہے۔تو وہ اپنے دل میں عکس ریز نوری تمثلات کو مرشد کے آئینے میں دیکھتا ہے۔یعنی مرید کے آئینے کا عکس اپنے بالمقابل آئینے میں پڑتا ہے۔چنانچہ وہ مرشد کے آئینے میں اپنی ذات کو دیکھتا ہے۔چونکہ آئینہ مرشد کا دل ہے۔یہی وجہ ہے کہ مرید مرشد کی ذات کے

اندر اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔نظر جیسے جیسے آئینے کی گہرائی پر پڑتی جاتی ہے۔نظر کی گہرائی نظر کا آئینے پر ٹھہر جانا ہے۔جب تک نظر آئینے پر ٹھہری رہتی ہے۔نظر کی روشنی آئینے کی سطح سے ٹکرا کر دیکھنے والے کے احساس میں جذب ہوتی رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ احساس گہرا ہو جاتا ہے۔احساس گہرا ہونے پر مرید کی نظر آئینے کی گہرائی میں عکس کو دیکھتی ہے اور گہرائی کی وجہ سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ شیخ کی ذات میں فنا ہوتا جا رہا ہے۔دل مرکز ہے اور ہر شے کے مرکز میں تجلی کا اک نقطہ ہے۔جسے نقطۂ ذات کہتے ہیں۔آئینے کے بالمقابل آ جانے کا مطلب یہ ہے کہ ایک نقطۂ ذات کی روشنی دوسرے نقطۂ ذات میں جذب ہو رہی ہے۔چنانچہ فنا فی الشیخ کے درجہ میں شیخ کے نقطۂ ذات میں مرید کے نقطۂ ذات کی روشنیاں جذب ہونے لگتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ روشنیوں کے جذب ہونے کی کیفیات کو فنائیت کا نام دیتا ہے۔تجلی ذات کا نقطہ ذات باری تعالیٰ کی تجلی ہے۔اس تجلی کا ذاتی تفکر وحدانیت ہے۔وحدانیت ذاتِ خداوندی کی صفت ہے۔روحانیت میں مرشد کی ذات اللہ تعالیٰ کا نائب بن کر کام کرتی ہے۔جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے۔اور اپنے بندوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے تاکہ اس کی ذات سے آرام پائیں۔اسی طرح مرشد کی تجلی ذات کے نقطے کی روشنیاں مقناطیسی قوت رکھتی ہیں۔اس مقناطیسی قوت کی گرفت میں جب کوئی مرید آ جاتا ہے تو وہ شیخ کی ذات سے قریب ہو جاتا ہے۔مگر یہ ساری کیفیات روشنیوں کے جذب کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔اس کا عمل داخلی طور پر ہوتا ہے۔جب باطن کی روشنیوں میں تبدیلی آ جاتی ہے تو ظاہر میں بھی آ جاتی ہے۔جو تبدیلی باطن سے ظاہر میں آتی ہے وہ دائمی ہے اور جو تبدیلی ظاہر سے باطن میں اثر کرتی ہے وہ عارضی ہے۔مرشد کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ مرید پر اپنا تصرف کر کے اس کے داخل کی روشنیوں میں تبدیلی پیدا کر دے۔تاکہ مرید کی طرزِ فکر مرشد کی طرزِ فکر جیسی بن جائے۔

میں نے اس موقع پر مرشد سے سوال کیا جو لوگ بغیر مرشد کے روحانیت کے راستے پر قدم رکھتے ہیں۔وہ کس طرح یہ منازل طے کرتے ہیں۔فرمایا: بیٹے! کارخانۂ قدرت کا ہر نظام نہایت ہی مربوط تنظیم کے ساتھ چل رہا ہے۔کائنات کی ہر شے اپنے دائرہ قانون میں حرکت کر رہی ہے۔روحانی علوم سیکھنے کے لئے ایک استاد کا ہونا ضروری ہے۔روحانی علوم روحانی استاد ہی سکھا سکتا ہے۔جیسا کہ دنیاوی علوم استاد سے سیکھے جاتے ہیں۔اس قانون کے تحت اگر کوئی شخص روحانی علوم سیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اپنی سعی کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کر لیتا ہے۔کیونکہ یہ بھی اللہ کا قانون ہے کہ بندے

کسی بھی کام میں جب کوشش کرتے ہیں تو کوشش کا صلہ اللہ انھیں دیتا ہے۔مگر شیطان اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق انسان کا کھلا دشمن ہے۔بغیر مرشد کے جب کوئی آدمی روحانیت کے راستے پر قدم رکھتا ہے تو شیطان ہر قدم پر اس کے راستے کی رکاوٹ بنتا ہے تا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے قریب نہ ہو سکے۔یہاں تک کہ اسے اللہ کے راستے سے اغواء کر لیتا ہے۔کیونکہ قرآن مجید کے مطابق اس نے دعویٰ کیا تھا کہ جس طرح تو نے مجھے اپنے راستے سے اغواء کیا میں بھی تیرے بندوں کو تیرے راستے سے اغواء کروں گا اور شیطان کو قیامت تک کے لئے اس کے کام کی مہلت بھی دی گئی ہے۔مرشد کی ذات روحانیت کے راستے پر مرید کی رہنمائی کرنے کے ساتھ ساتھ اسے شیطان کے شر سے بھی تحفظ دلاتی ہے۔مگر یہ بات بھی یاد رکھو کہ روحانی علوم روح سے تعلق رکھتے ہیں اور روح باطن ہے۔کوئی مرید اپنے باطن میں شیخ کی روشنیوں کو جس حد تک جذب کرتا ہے اور جس حد تک اپنی طرز فکر میں ڈھالتا ہے۔اسی قدر اسے شیخ کے علوم منتقل ہوتے ہیں اور اسی مناسبت سے مرید کی صلاحیتیں بھی ابھرتی ہیں۔اس سلسلے میں مرشد کی قربت وصحبت بہت ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے قصے میں اس قانون کو بیان کیا ہے۔جب موسیٰؑ سے غلطی ہو گئی اور نادانستگی میں آپؑ سے ایک شخص کا قتل ہو گیا اور آپؑ مدین چلے گئے۔وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ آپؑ کی ملاقات ہوئی اور آپؑ ان کے فرمانے سے ان کے پاس تقریباً دس سال رہے۔یہ دس سال آپؑ کا تربیتی دور تھا۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو فرعون کی طرف رسول بنا کر بھیجا اور اللہ تعالیٰ جو کام آپؑ سے لینا چاہتے تھے وہ کام آپؑ سے لے لیا۔پس اللہ تعالیٰ کی سنت کے قوانین کائناتی نظام کی اساس ہیں۔ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ازل اور ابد کی حدود میں کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی پیروی کرنے پر مجبور ہے۔سزا و جزا کا دارومدار بھی قانون کے دائرے میں ہے۔ذاتِ باری تعالیٰ اپنی ہستی میں مخلوق پر انتہائی رحم کرنے والی ہستی ہے۔وہ سراپا محبت ہے۔مگر بندہ جب اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے دائرے میں قانون کی گرفت میں آ جاتا ہے تو اللہ کا قانون اسے پکڑ لیتا ہے۔جیسے قتل کی سزا پھانسی ہے۔کوئی آدمی قتل کرتا ہوا پکڑا جائے تو حکومت کا قانون اسے پھانسی کی سزا دے دیتا ہے۔پھانسی کی سزا اسے قانون نے دی۔نہ کہ قانون بنانے والے نے۔اللہ نے قانون بنا کر بندوں کو ان کے علوم عطا کر دیئے ہیں تا کہ وہ ان کے مطابق اپنی زندگی بسر کریں اور کوئی ایسی خلاف ورزی نہ کریں کہ گرفت ہو جائے۔

کچھ دن انہی کیفیات میں گزر گئے۔میں حسبِ معمول شام کو شیخ احمد کے پاس ضرور جاتا۔کبھی

کبھار ثریا کو بھی لے جاتا۔ وہ بڑی اچھی اچھی باتیں بتاتے۔ دعائیں دیتے۔ مرشد کی عنایات پر میرے اندر ہر وقت اللہ تعالیٰ کے شکر کا تصور رہتا اور میں ہر وقت سوچتا کہ اللہ کی ذات اپنے بندوں پر کس قدر مہربان ہے۔ مرشد کی ان تھک کوششوں سے یہ روحانی سلسلہ اب بڑھتا چلا جا رہا تھا اور لوگ آپ کی روحانی تحریروں سے متاثر ہو کر آپ کے پاس آتے تھے۔ اب تو بہت سی عورتیں بھی محفل میں آنے لگی تھیں۔

محفل میں ادب و احترام اور آدابِ مجلس پر بہت زیادہ زور دیا جاتا۔ شیخ احمد اکثر فرماتے۔ دنیا کی زندگی کے شب و روز کا ہر پل لوحِ محفوظ کی تحریر کا عملی مظاہرہ ہے۔ دنیا میں وہی کچھ ہو رہا ہے جو لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔ یہی نوری تمثلات لوحِ محفوظ سے عکس در عکس نیچے اترتے ہوئے مادی صورتوں میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لوحِ محفوظ پر آدم کا تمثل اللہ تعالیٰ کے نائب کی حیثیت سے موجود ہے۔ لوحِ محفوظ پر یہ تمام تمثلات نوری صورتوں میں موجود ہیں۔ لوحِ محفوظ اللہ تعالیٰ کا وہ علم ہے جسے اللہ پاک نے کُن کہہ کر ظاہر کیا ہے۔ دنیا میں مرشد یا روحانی استاد کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے نائب اور خلیفہ کی ہے۔ ایک روحانی استاد اور مرشد اللہ کا نائب بن کر روحانی علوم لوگوں کو سکھاتا ہے۔ اس طرح لوحِ محفوظ کا یہ تمثل دنیا میں عملی طور پر اپنا مظاہرہ کرتا ہے۔ چونکہ روحانی استاد اپنے طالب علموں کی توجہ اور نظر عکس سے ہٹا کر لوحِ محفوظ کے حقیقی تمثل کی جانب لے کر چلتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے اندر آہستہ آہستہ وہی آداب اور خلوص و یگانگت کے احساس کو متحرک کرتا ہے۔ جو آدم کو بندگی کی چوکھٹ پر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کیونکہ لوحِ محفوظ کے حقیقی تمثل میں آدم کا معبود اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہیں کہ ''ہم نے آدم کو اسمائے الٰہیہ کے کل علوم عطا فرمائے ہیں''۔ اللہ اور آدم کے درمیان خالق اور بندے کا رشتہ ہے۔ روحانیت کے راستے میں مرشد کی محفل میں بیٹھ کر مرید بندگی کے آداب و اصول سیکھتا ہے۔ بندگی کے آداب ذاتِ خالق کے اشاروں کو سمجھنا ہے تاکہ خالق کے اشاروں پر اس طرح حرکت کرے، جس طرح کٹھ پتلی مالک کے اشاروں پر حرکت کرتی ہے۔ بندگی اپنی ذات کی ہستی اور ذات خالق کی ہستی سے واقف ہونا ہے۔ مرشد کی محفل میں مرید جب بندگی کی چوکھٹ پر سر رکھ دیتا ہے۔ تو اسے مرشد کی طرز فکر عطا ہو جاتی ہے۔ یہی منزل فنا فی الشیخ کہلاتی ہے۔ اس منزل میں مرید شیخ کے اشاروں پر اپنے آپ کو کٹھ پتلی کی طرح متحرک کر دیتا ہے۔ یہی بندگی کا پہلا قدم ہے جو مرید جس حد تک اپنی ذات کو شیخ کی ذات میں فنا کر دیتا ہے۔ اسے اسی حد تک شیخ کے علوم منتقل ہو

جاتے ہیں۔

زندگی کا دریا نہایت ہی روانی کے ساتھ بہتا جا رہا تھا۔ میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی یقیناً قدرت کا بہترین تحفہ ہے۔ مجھے آج اس بات کا عملی تجربہ ہوا۔ زیما کے ساتھ زندگی جنت کے خواب کی تعبیر دکھائی دی۔ بچپن میں دادی اماں اپنے پہلو سے لپٹائے ہوئے بڑے پیار سے کہا کرتی تھیں۔ میرا بیٹا تو جنت میں رہے گا۔ میں کہتا جنت کیسی ہوتی ہے۔ دادی اماں کہتیں جیسا اپنا گھر ہے۔ خوب بڑا سا محل، خوب بڑا سا باغ، خوبصورت لوگ، خوبصورت حوریں۔ حوریں سب کی خدمت کرتی ہیں۔ میں پُر جوش لہجے میں کہتا، وہاں میرے دوست بھی ہوں گے نا۔ دادی اماں کہتیں ہاں بیٹے وہاں سب لوگ ہوں گے۔ آج دادی اماں کا یہ خواب بھی پورا ہو گیا۔ ان کے محبت بھرے تصور نے میرے لئے دنیا میں جنت تخلیق کر دی۔

زیما ان دنوں اُمید سے تھی۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اپنی مخلوق پر محیط ہیں۔ ہم ہی اسے بھول جاتے ہیں وہ ہمیں کبھی نہیں بھولتا۔ بھول کا خانہ تو ہمارے اندر ہے۔ جوں جوں زیما کے ماں بننے کے دن قریب آ رہے تھے۔ میرے اندر بھی محبت کا ایک لطیف چشمہ پھوٹتا محسوس ہوتا تھا۔ چھوٹے بچوں پر خود بخود نظر ٹھہر جاتی۔ ان کے پردے میں مجھے اپنا بچہ نظر آتا اور بے ساختہ بچوں پر پیار آ جاتا۔ حالانکہ اس سے پہلے مجھے بچوں سے کوئی محبت نہ تھی۔ اب اپنے اندر حواس کی ہر تبدیلی پر نظر جاتی تھی اور ہر چیز کا رابطہ خود بخود اللہ تعالیٰ سے جا ملتا تھا۔ اب جب بھی میرے اندر بچے کی محبت ابھرتی۔ یہی خیال آتا کہ یہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ جس طرح بچہ ماں باپ کی تخلیق ہے۔ ماں باپ کو اپنی تخلیق سے اتنی انسیت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے کس قدر محبت ہو گی۔ میرا خیال گہرائی میں چلتا چلتا جیسے اندھے کنوئیں میں ڈوب جاتا۔ میں سوچتا۔ اللہ کی محبت اندھے کنوئیں کی مانند ہے۔ جس کی تہہ کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس لمحے یوں محسوس ہوتا جیسے فطرت میری ماں ہے۔ جس کی نرم و گرم آغوش میں میرا وجود سکون کی نیند لے رہا ہے۔ اللہ کی شان نرالی ہے۔ اللہ اپنے بندوں کو نت نئے طور سے اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

انہی دنوں زیما نے خواب دیکھا کہ دادی اماں ہمارے گھر آتیں ہیں۔ انھوں نے اپنی چادر میں کچھ چھپایا ہوا ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی زیما کو آواز دیتی ہیں۔ زیما بھاگ کر ان کے پاس آتی ہے اور گلے ملتی ہے۔ ان کے آنے پر خوشی کا اظہار کرتی ہے۔ دادی اماں اپنی چادر میں سے ایک بڑا سا

آم نکالتی ہیں اور زیما کو دیتی ہیں کہ یہ میں تمہارے لئے جنت کے باغ سے توڑ کر لائی ہوں ۔زیما خوشی خوشی اس آم کو لے کر اپنے سینے سے لگا لیتی ہے ۔اس خواب کا مطلب ہم نے نیک اولاد سے لیا ۔چند ہی دنوں میں ہم دونوں ایک بیٹے کے ماں باپ بن گئے ۔ بچے کے کان میں شیخ احمد نے اذان دی اور نام بھی انھوں نے ہی تجویز کیا سید نعمان علی ۔زیما بچے کو پہلی نظر دیکھتے ہی بول اُٹھی ۔سلمان دادی اماں نے جنت کا ایک آم نہیں بلکہ جنت کا سارا باغ ہی ہماری جھولی میں ڈال دیا ہے۔سارا گھر سارا خاندان بچے کی آمد پر خوش تھا۔یوں لگتا تھا کہ زمین سے آسمان تک خوشیوں کے شادیانے بج رہے ہیں۔شیخ احمد کے الفاظ میرے ذہن میں گونجنے لگے ۔خوشی اور غم داخلی کیفیات کا نام ہے ۔جب حواس کے دائروں میں خوشی کی لہریں جذب ہو جاتی ہیں تو یہ لہریں حواس کے دائروں میں انتہا تک سفر کرتی ہیں ۔اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کائنات کی ہر شئے پر خوشی کا رنگ چھایا ہوا ہے ۔دراصل ہمارے اندر حواس کے بے شمار دائرے کائناتی حواس کی درجہ بندیاں ہیں ۔ جوں ہی حواس کے ان دائروں میں تبدیلی آتی ہے ۔تو ساری کائنات میں تبدیلی آجاتی ہے ۔ساری کائنات انسان کے داخل میں ہے ۔حواس کی درجہ بندی کا نام کائنات ہے ۔

ہماری محفل میں نئے نئے لوگ دن بدن شامل ہوتے جا رہے تھے۔ایک دوسرے سے سن سنا کر لوگ آتے جاتے ہیں ۔مگر روحانی طرزِ فکر کو سمجھتے ہوئے بھی زمانہ لگ جاتا ہے ۔بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کثرت سے وظائف پڑھنے سے ان کے اندر کوئی غیر معمولی قوت آجائے گی ۔جس سے کام لے کر وہ دنیا میں اپنا سکہ جما سکیں گے اور آخرت کو بھی اس کے عوض خرید سکیں گے ۔ یہ درست ہے کہ انسان دنیا و آخرت دونوں کی ضمانت چاہتا ہے ۔مگر ہر کام اپنے اصول پر ہوتا ہے ۔بھلا انسان کی عقل اللہ کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہے ۔ایک صاحب نئے نئے آنا شروع ہوئے ۔ان کی آنکھیں سرخ رہتیں ۔ذہن ماؤف رہتا۔جیسے نشے میں ہوں ۔انہوں نے اپنا حال یوں بیان کیا کہ انہیں ہمزاد یا مؤکل طابع کرنے کا بڑا شوق تھا۔انھوں نے اس سلسلے میں کئی کتابیں پڑھیں ۔کئی عاملوں سے ملے جس نے جو عمل بتایا وہ کر لیا ۔آدھی آدھی راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر چلے کھینچتے ۔کئی سال ان کا یہی معمول رہا۔اس دوران ان کا کاروبار بھی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ کیونکہ بیک وقت کئی کئی وظیفے جاری تھے ۔کبھی ظہر کے بعد، فجر کے بعد، سارا ذہن وظیفوں میں لگا رہتا ۔کاروبار کون کرتا ۔ بچے کو پڑھائی سے ہٹایا کہ وہ دکان پر بیٹھے ۔وہ چودہ سال کی عمر میں پڑھائی چھوڑ کر دکان پر بیٹھا تو ناتجربہ کاری کی وجہ سے خراب ہی ہوتی گئی ۔جس کی

وجہ سے باپ بیٹے میں بھی کِل کِل ہونے لگی۔ گھر میں پریشانیوں نے ڈیرہ ڈال لیا۔ بال بچوں کی پریشانیاں کبھی نظر ہی نہیں آئیں۔ اگر کبھی ذہن اس طرف گیا بھی تو یہی خیال آتا کہ مؤکل طابع ہو جائے تو اس سے الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح کام لے کر گھر کے سارے دلدر دور کر دیں گے۔

وظائف اور چلّوں کی زیادتی نے دماغ میں خشکی پیدا کر دی۔ نیند اُڑ گئی۔ نیندیں اُڑنے سے دماغی توازن ڈانواں ڈول ہو گیا۔ مؤکل پھر بھی طابع نہ ہوا۔ طابع ہونا تو کیا دکھائی بھی نہ دیا۔ اب اعصابی دباؤ کا شکار ہیں۔ دماغ کی رفتار اتنی سست ہو گئی ہے کہ کسی کام کے نہیں رہے ہیں۔ شیخ احمد سے فرمانے لگے کہ آپ تو روحانی عالم ہیں۔ اپنی شاگردی میں قبول کر لیجئے۔ شاید آپ کے طفیل ہمارا کام بن جائے۔ ان کی داستان سن کر اور ان کی ذہنی حالت دیکھ کر ہم سب اس بات پر حیران رہ گئے کہ اب بھی ان کے اندر مؤکل طابع کرنے کا جنون سوار ہے۔

انھیں شیخ احمد نے اور ہم سب نے ہی بہت سمجھایا کہ ہمارے یہاں ایسا کوئی عمل نہیں ہے جس سے مؤکل طابع ہو سکے۔ مگر وہ کئی بار لگاتار محفل میں آتے رہے۔ مگر چونکہ روحانی باتوں سے وہ متحمل نہ تھے۔ جس کی وجہ سے لیکچر کے دوران انھیں نیند آجاتی تھی۔ پھر آخر کار انھوں نے خود ہی آنا بند کر دیا۔ اس دوران شیخ احمد نے ہمیں ہمزاد اور مؤکل کے متعلق بہت مفید معلومات فراہم کیں۔ میرے دل میں خیال آیا۔ ان صاحب کو اللہ نے وسیلہ بنا کر بھیجا تا کہ اللہ تعالیٰ ان علوم سے ہمیں نوازے۔ بلاشبہ اللہ اپنے بندوں کو بہت عجیب و غریب طریقوں سے نوازتا ہے۔

سب سے پہلے تو شیخ احمد نے یہ بتایا کہ ہمزاد یا مؤکل کیا ہے۔ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''ہر شئے اللہ کی طرف سے آرہی ہے اور اللہ ہی کی جانب لوٹ کر جانے والی ہے''، ''اللہ تعالیٰ نور ہے''۔ چنانچہ اللہ کی جانب سے آنے والی ہر شئے نور کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ اسی بات کو قرآن میں ''اللہ کا نور آسمانوں اور زمین کا نور ہے'' کہا گیا ہے۔ ہر شئے کے اندر اللہ کا نور اس شئے کی روح ہے۔ اس مادی دنیا میں روح اللہ کے حکم سے آتی ہے تو اپنے اوپر مادی لباس پہن لیتی ہے۔ یہی مادی لباس جسم ہے۔ اس جسم کو روح کنٹرول کرتی ہے۔ روشنی کا جو جسم اس مادی جسم کو کنٹرول کر رہا ہے اور حرکت میں رکھے ہوئے ہے۔ وہ جسم ہمزاد یا مؤکل ہے۔ اسے جسم مثالی کہتے ہیں۔ فطری طور پر تو روشنیوں کا یہ جسم مادی جسم پر حکومت کر رہا ہے اور مادی جسم اس کے طابع ہے۔ گویا دن کو رات اور رات کو دن کرنا چاہتا ہے۔ یہ پلان ہی فطرت کے خلاف ہے پھر کس طرح کامیابی کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ جب وظائف

اور چلّے کھینچے جاتے ہیں تو ہر اسم اور ہر آیت چونکہ اللہ کا کلام ہے اور اس کلام میں نور کی مقداریں موجود ہیں۔ کسی اسم اور آیت کے پڑھنے سے یہ نور ہمارے دماغ میں داخل ہوتا ہے۔ دماغ کے خلیے نہایت ہی نازک ہیں۔ یہ انوار اور روشنی مقداروں کے عدم توازن کی وجہ سے دماغ کے خلیوں کو جلا ڈالتی ہے۔ اس طرح شعور غیر متوازن ہو جاتا ہے اور نارمل زندگی متاثر ہو جاتی ہے۔ دماغ سے ہر دم روشنیاں خارج بھی ہوتی رہتی ہیں۔ کسی فرد میں سے خارج ہونے والی یہی غیر متوازن لہریں۔ سارے گھر مین پھیل جاتی ہیں اور سارے گھر کے نظام کو چوپٹ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اس طرح ایک آدمی کی غلطی کا اثر گھر کے سارے ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔ فرمانے لگے۔ چلّے الٹنے کی بھی یہی وجوہات ہیں کہ آدمی اپنی دماغی سکت کو پہچانے بغیر ایسے وظائف کرتا ہے جن کی روشنیاں اور توانائیاں دماغ برداشت نہیں کر پاتا اور چونکہ ہمارا جسمانی نظام دماغ کی جذب کردہ والٹیج پر چل رہا ہے۔ والٹیج کی مقرر کردہ مقداروں میں گڑبڑ ہونے سے سارا جسمانی نظام متاثر ہو جاتا ہے۔ یہ سب سن کر میں سوچنے لگا۔ آج کے دور میں جہاں سائنس نے توانائی کی مخصوص مقداروں سے مختلف ایجادات کی ہیں۔ ایٹم بم بنا ڈالے ہیں۔ ہمارے سامنے یہ بات آچکی ہے کہ روشنی کا ہر ذرہ ایک مخصوص توانائی رکھتا ہے۔ ہم ان علوم کی طرف کیوں نہیں توجہ دیتے کہ کائنات کو کون کون سی روشنیاں اور توانائیاں کنٹرول کر رہی ہیں۔ خود ہمارا جسم مثالی کن روشنیوں سے مل کر بنا ہے۔ وہ کس طرح ہمارے اندر اس قدر انانیت ہے کہ ہم کسی قیمت پر زیر ہونا پسند نہیں کرتے۔ جھوٹی انا کا جنازہ کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ کبھی ہم نے اللہ کے فعل کی طرف بھی نظر کی ہے کہ اللہ پاک نے اپنی انا کی پہچان کس طرح اپنے بندوں میں کرائی۔ اس نے دنیا میں اپنی انا کو پوشیدہ رکھ کر مخلوق کی انا کو ظاہر کر دیا تا کہ بندہ اپنی توانائی کو دیکھ کر خود اپنی انا کے پردے میں کام کرنے والی توانائی اور حقیقی انا کی تلاش کرے۔ وہ حقیقت وہ قوت جس نے ہمیں سہارا دیا ہوا ہے۔ جو خود ہر حاجت سے بے نیاز ہے۔ ساری کائنات اس کی قدرت کے کندھوں پر ہے۔ اس نے ساری کائنات کی ناتوانی کا بوجھ اُٹھا کر اپنی عظمت کا جھنڈا بلند کیا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ ہر شئے پر اپنا رعب ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنے سے نیچا دیکھنا چاہتے ہیں۔

ذرا سوچو تو سہی آج اگر اللہ اپنی قدرت کے مضبوط کندھے کائنات سے ہٹا لے۔ تو ساری کائنات فنا ہو جائے گی۔ کائنات ایک مردہ جسم ہے۔ اللہ کا نور اس مُردہ جسم کی حیات اور توانائی ہے۔ آج ہم اپنی زندگی اپنی حیات سے بھی واقف نہیں ہیں۔ یہ ساری باتیں ذہن میں آتے ہوئے جہاں میرا

دل درد سے بھر گیا وہاں ایک نیا جوش نیا ولولہ اور عزم بھی پیدا ہو گیا کہ دنیا والوں کی توجہ ان کے اندر کام کرنے والی روح کی جانب دلانی ضروری ہے۔ میرا ذہن پیغمبروں کی جانب گیا جنہوں نے اپنی جان پر کھیل کر اللہ کے مشن کو پھیلا دیا اور ہمارے لئے ایسی راہیں کھول گئے۔ جن پر چل کر ہم با آسانی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ میرا ذہن شیخ احمد کی جانب گیا۔ ایک روحانی استاد بھی پیغمبروں کے مشن کو لوگوں میں آگے بڑھاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حضور پاک صلی علیہ وآلہ وسلم کی بے پناہ محبت اور احترام دل میں جاگ اٹھا۔ ہر وقت میرا ذہن حضور پاکؐ کی جانب رہنے لگا۔ میں نے کئی کتابیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ پر پڑھ ڈالیں۔ حدیثیں پڑھیں۔ ان دنوں نعتیں پڑھنے اور سننے میں بھی بڑا ہی سرور آتا۔ میں شیخ احمد سے بھی اکثر حضور پاکؐ کی زندگی، اُن کی سیرت کے متعلق ہی سوال کرتا۔ ہر وقت آپؐ ہی کا تصور ذہن پر چھایا رہتا۔ مرشد کریم نے فرمایا تم درود شریف پڑھا کرو اب جب بھی موقع ملتا درود شریف کا ورد زبان پر رکھتا۔

ایک رات میں مراقبہ میں تھا کہ مجھے خیالات آنے شروع ہوئے۔ حقیقتِ محمدیؐ اللہ تعالیٰ کی تجلی ذات کا جمال ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کائنات بنانے کا ارادہ کیا۔ تو اپنی ذات کی تجلیات پر اپنے ارادے کی نظر ڈالی۔ ارادے کی نظر کی روشنی میں ذات کی تجلیات کا جمال ظاہر ہو گیا۔ تجلیٔ ذات کے جمال کا یہ عالم حقیقتِ محمدیؐ ہے۔ اسی جمال کو اللہ تعالیٰ نے کُن کہہ کر مادی صورت بخش دی۔ کائنات کا وجود حقیقتِ محمدیؐ کا ظہور ہے۔ جس کی حدود ازل سے ابد تک ہے۔ جیسے ہیرے کے اندر چمک ہیرے کا ایک جزو ہے جب ہیرا روشنی میں لایا جاتا ہے تو یہ چمک دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح تجلیٔ ذات کا جزو تجلی کا جمال ہے۔ جب اللہ نے چاہا کہ اس جمال کو ظاہر کیا جائے تو کُن کہہ کر اسے صورت بخش دی۔ کُن کے بعد تمام مظاہرات تجلی کے جمال کا مظاہرہ ہیں۔ اس جمال کا نام حقیقتِ محمدیؐ ہے اور اس کا مظاہرہ کائنات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر آپؐ نہ ہوتے تو کائنات بھی نہ ہوتی۔ آپؐ باعثِ تخلیق کائنات ہیں۔ اگر ہیرے میں چمک نہ ہوتی تو چمک کا تصور بھی نہیں آتا۔ جب تصور نہ آتا تو آنکھ ہیرے میں چمک کیسے دیکھتی۔ اس کے ذہن میں تو چمک کا خیال ہی نہ آتا۔ اسی طرح تجلی ذات کے اندر تجلی کا جمال ہمیشہ سے موجود تھا۔ یہی جمال کائنات کی تخلیق کا باعث بنا۔ اس لئے آپؐ باعثِ کائنات ہوئے۔

اس گھڑی مجھے اپنے اندر حضور پاکؐ سے بے انتہا محبت کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی بار بار

یہ خیال آتا کہ یہ ساری عنایت میرے مرشد کی ہے۔انہی کی توجہ سے میرا ذہن کھلا ہے۔ مجھے یوں لگتا جیسے مرشد دروازہ ہے اور میں اس دروازے سے اندر جھانک رہا ہوں اور جو کچھ دیکھا ہے وہ اندر کا منظر ہے۔ مجھے اس وقت شیخ احمد کی یہ بات یاد آئی۔مرید مرشد کی نظر سے جو خود اپنے نقطہ ذات میں تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔نظر کا قانون ہے کہ نگاہ روشنی میں دیکھتی ہے۔ پس مرشد اپنی نگاہ کی روشنی مرید کو عنایت کرتا ہے۔اس کی روشنی میں مرید اپنے نقطۂ ذات کے اندر مشاہدہ کرتا ہے۔مرید کے نقطۂ ذات پر مرشد کی نظر اور تفکر کی روشنی محیط ہوتی ہے۔جس کی وجہ سے روحانیت میں مرید کا ہر قدم مرشد کی عنایت اور فضل وکرم ہے۔

نعمان اب گھٹنوں چلنے لگا تھا۔سارے گھر میں بھاگا پھرتا۔اس کے آنے سے گھر میں بڑی رونق تھی۔خصوصاً می اور چچی تو ہر وقت بیٹھی نعمان سے کھیلتی دکھائی دیتیں۔اکثر انھیں بیٹھے دیکھ کر مجھے دادی اماں یاد آجاتیں۔میرا عکس نعمان کے وجود میں اور دادی اماں کا عکس می کے وجود میں ڈھل جاتا اور دونوں عکس رنگوں کے دریا میں ڈوبے دکھائی دیتے۔کاش دادی اماں کچھ دن اور ہمارے ساتھ رہتیں۔زندگی ایک ایسا نغمہ ہے۔جس میں روح کی کسک پوشیدہ ہے۔اللہ تعالیٰ سے بچھڑنے کی کسک۔ اللہ پاک کی نافرمانی کی پشیمانی کی کسک یہی کسک زندگی کے لمحات میں ابھرابھر کر اپنا عکس دکھاتی رہتی ہے۔میں ان خیالات کی گہرائی میں ڈوبتا چلا جاتا۔مجھے کون یاد آتا ہے۔نہ عقل جانتی ہے نہ دل کو پتہ ہے۔مجھے کس کی یاد آتی ہے۔اس بچھڑے یار کو تو روح کی کسک ہی ڈھونڈ سکتی ہے۔میرا جی چاہتا میں کائنات میں بکھرے ہوئے درد کو اپنے اندر سمیٹ لوں تاکہ وہ لمحہ مجھے مل جائے جس لمحے روح اپنے رب سے جدا ہوئی تھی۔میرا جی چاہتا میں ساری مخلوق کی بجائے اکیلا ہی دوزخ کی آگ میں جل کر اس لمحے کو پالوں۔یہ کسک روز بروز دل میں بڑھتی جاتی اور اللہ کے بندوں کے لئے بے پناہ محبت دل میں پیدا ہونے لگتی۔خیال آتا لوگوں کے گناہ روح کی اضطراری کیفیت ہے۔لوگ اپنی روح سے واقف نہیں ہیں۔جس کی وجہ سے وہ نہ ان کیفیات کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان کا سدِ باب کر سکتے ہیں۔مگر میں تو روح کے درد سے واقف ہوں کہ اس نے کیا کھو کر کیا پایا ہے۔مخلوق کے گناہوں اور غلطیوں سے مجھے ایک عجیب روحانی کسک اور تکلیف ہوتی۔کسی کی غلطی پر ظاہری طور پر غصہ آتا نہ ذہن الجھتا۔بلکہ اندر گہرائی میں درد کی لہروں میں اضطراب آجاتا۔جیسے یہ گناہ یہ غلطی ایک ایسا کنکر ہے جو میرے تالاب میں کسی نے پھینک دیا ہے۔درد کی لہریں اندر ہی اندر پکار اٹھتیں۔نادان بندے۔تو کب جانے گا کہ

تیرا وجود اس رحمان اور رحیم ہستی کے احاطہ میں ہے۔ وہ ذاتِ رحیم تیری ذات پر محیط ہے۔ تو کب اس محیط کو پہچانے گا۔ کب تک اپنے شرار کی چنگاریاں اپنی ذات میں ڈالتا رہے گا۔ وہ بجھاتا رہے گا۔ یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ جب تک تو گناہ پر آمادہ رہتا ہے۔ تیری نظر اپنی آگ پر ہے۔ نار نور کی ضد ہے۔ تو جلتا رہے گا وہ مٹاتا رہے گا اور پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا جب وہ تجھے جلنے پر مُصر دیکھ کر تجھے تیری مرضی پر چھوڑ دے۔ تب مسلسل آگ تجھ سے کب برداشت ہوگی۔ اس خیال نے مجھے لوگوں پر حد درجے مہربان بنا دیا۔ اکثر تنہائیوں میں مجھے یوں لگتا جیسے میں آگ کے دریا میں ہوں اور وہاں سے لوگوں کو پکڑ پکڑ کے باہر نکال رہا ہوں۔ دوزخ کی آگ نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا ہے۔ مگر مخلوق کی آہ و بکا نے میرے اندر شعلے بھر دیئے ہیں۔ انھیں دوزخ سے باہر نکال نکال کے میں خود اپنے اندر کے شعلے بجھا رہا ہوں۔ اور اپنے اندر کی اس آگ سے مجبور ہو کر اس کریم کی بارگاہ میں ماتھا ٹیک دیتا۔ اے میرے پروردگار! دوزخیوں پر رحم فرما۔ یہ تیرے ناتواں بندے ہیں۔ تیری سزا کے متحمل نہ ہو سکیں گے۔ ان پر رحم فرما۔

اے میرے رب! تیرے اِسرار تو میری روح میں پلتے ہیں۔ میری روح اس بات سے واقف ہے کہ دوزخ میں جلنے والے نفوس تیرے اسرار سے واقف نہیں ہو سکتے۔ جن نفوس پر دوزخ کی آگ اثر کرتی ہے۔ جو نفوس تیری ذات سے قریب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ لکڑی جب آگ کا اثر قبول کرتی ہے۔ تو وہ آگ بن جاتی ہے۔ پھر اسے لکڑی نہیں کہا جاتا۔ دوزخ کی آگ میں جل کر جو نفوس خود آگ کا جزو بن جائیں انھیں آگ سے کیسے الگ کیا جائے گا۔ کیونکہ انھوں نے تو آگ کو اپنی جان میں سمو لیا ہے۔ جیسے کوئلہ آگ میں جل کر خود آگ بن جاتا ہے۔ آگ ذات ابلیس ہے۔ ابلیس کی آگ کو قبول کرنے والا نفس بھی ابلیس بن جاتا ہے۔ رحمانی نفس تو وہ ہے جو دوزخ کی آگ میں گھر کر بھی آگ کا اثر قبول نہ کرے۔ دوزخ کے ستر ہزار آگ کے دریاؤں سے گزر کر بھی اس کے قبائے نفس پر ایک چنگاری کا نشان بھی نہ پڑے۔ ایسے رحمانی نفوس کو اللہ تعالیٰ نے دوزخ کا فرشتہ کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے دوزخ کے انتظامات پر انھیں فرشتے مقرر کیے ہیں۔ ذرا تو سوچیے۔ اگر دوزخ پر جو کہ ابلیس اور نافرمان لوگوں کا ٹھکانہ ہے۔ اگر اس کا حاکم ابلیس اور نافرمان بندے کو بنا دیا جاتا تو وہ سارے کے سارے ان نافرمان لوگوں سے مل جاتے۔ اللہ کا مقصد تو آگ اور دوزخ کی سزا دینے سے یہ ہے کہ نافرمان نفس اللہ تعالیٰ کا تابع ہو جائے۔ پھر یہ مقصد کیسے حاصل ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوزخ کا حاکم

فرشتوں کو مقرر کیا۔ جو نوری مخلوق ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبردار اور وفادار ہے۔ جن کے اندر غداری کا ذہن نہیں ہے۔ پس ایسے رحمانی نفوس کے قبائے نفس پر کب آگ اثر کرسکتی ہے۔

میرا ذہن ہر وقت قرآنی آیات کی ایسی ایسی تاویلات پیش کرتا رہتا۔ میں انھیں مضامین بنا کر لکھتا اور محفلوں میں لوگوں کے سامنے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتا۔ مجھے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بندوں پر شفقت کرنے کی وجہ سمجھ میں آتی کہ آپؐ جو اللہ کے بندوں پر حد درجے مہربان تھے۔ وہ اسی وجہ سے تھے کہ آپؐ نے نور کی حقیقت کو پہچان لیا تھا اور اس بات سے واقف تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے کے ساتھ کائنات اور کائنات کے اندر موجود ہر شئے کو پیدا کیا ہے۔ پس جس شئے کو اللہ کے ارادے کے خلاف کوئی مٹا نہیں سکتا۔ سزا اور عذاب دینے سے اللہ کا ارادہ نافرمانوں کو مٹانا نہیں ہے۔ بلکہ ان کے ناری نفوس کے اندر نوری صفات پیدا کرنا ہے تاکہ نار کی تکلیف کو مٹا کر، وہ نور کی ٹھنڈک اور آرام محسوس کریں۔ اللہ کے ارادے کو جان کر آپؐ لوگوں کے دُکھ درد کا مداوا بن گئے۔ تاکہ وہ نور کی ٹھنڈک کو اپنے اندر محسوس کریں اور غلط ارادوں کو چھوڑ دیں۔ جب تک مخلوق خدا سے ایسی محبت اور شفقت نہ ہو۔ کوئی کب مخلوق کی ایذا رسانیوں کو صبر و استقلال کے ساتھ سہہ سکتا ہے۔ میرے ذہن میں حضور پاکؐ کی زندگی اور قرآن میں بیان کی گئی تمام پیغمبروں کی زندگی کے وہ دور اپنی جھلکیاں پیش کرنے لگے۔ جن میں اللہ پاک نے ان کی اُمت کے ظلم و ستم کی داستانیں بیان کی ہیں۔ میرا دل، میری روح، میرا سر پیغمبران علیہ السلام کی عظمتوں کے آگے جھک گیا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی ذات و صفات کو پہچاننے والے اس کے پیغمبران علیہ السلام ہی ہیں۔ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنی ذات میں اس طرح سمو لیا ہے کہ ان کی اپنی ذات اس کے نور کا جز بن گئی ہے۔ اب اس نور سے انھیں کون جدا کرسکتا ہے۔ قطرہ دریا میں ملے تو دریا بن جائے۔

اے باری تعالیٰ! کیا میں وجود کا وہ قطرہ نہیں ہوں جو تیری وحدانیت کے سمندر سے نکل کر تیری نفی کے صحرا میں بھٹک کر اپنی ہستی کا راگ الاپ رہا ہوں۔ یہ راگ تو تیرے ہونٹوں کا نغمہ ہے۔ میں تو فقط بانسری ہوں۔ اے بانسری، تو آج خود اپنی ہستی کے دریا میں غرق ہوکر اس کی ہستی کے سمندر سے سر نکال تاکہ تجھے اس کے وہ لب دکھائی دیں جن سے نغمات بلند ہورہے ہیں۔ مجھے اپنی ہستی بانسری کا خلاء دکھائی دی۔ جس میں اس کی پھونک اس کی ھوا جا رہی تھی۔ میرا جی چاہا میں اس بانسری کو توڑ دوں۔ اس کی خلاؤں کو پاٹ دوں تاکہ سب کچھ وہ ہی وہ رہ جائے۔ میرا دل اپنی ہستی کے وجود سے

بیزار ہونے لگا۔ جس طرح ننھا بچہ ماں کی آغوش سے نکل کر دوبارہ اس کی گود کے لئے مچلتا ہے۔ میری بھی وہی حالت تھی کہ مجھے اپنا وجود بغیر اس کے کسی طرح گوارہ نہ تھا۔ ایک غم تھا جو اپنی ہستی کو چاٹنے لگا۔ ایک روگ تھا جو روح کو چمٹ گیا۔ میں خود اپنی ہستی کے درمیان بے بس تماش بین بن گیا۔

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے

کلیم

یک شعلہ برق خرمنِ صد کوہِ طور تھا

اس طرح مہینوں گزر گئے۔ دنیا کے سب کام اپنی سطح پر ہوتے رہے۔ مگر دل اپنی دنیا میں مشغول رہتا۔ دل کی مشغولیت تو عشق ہے اور عشق کا محور و مرکز محبوب ہے۔ اس مرکز عشق کی تین گہرائیاں دکھائی دیتیں۔ ایک گہرائی مرشد کی ذات تھی۔ دوسری گہرائی حضور پاکؐ کی ذات تھی اور تیسری گہرائی اللہ پاک کی ذات تھی۔ مجھے یہ تینوں گہرائیاں ایک ہی نقطے میں نظر آتیں یہ نقطہ میرا دل تھا۔ جس میں تینوں ہستیوں کا عشق موجود تھا۔ مجھے یوں لگتا جیسے میرا دل ایک قندیل ہے۔ جس میں ایک شیشہ ہے۔ شیشے میں بتی ہے بتی میں تیل ہے۔ تیل جب بتی کو جلائے گا تو بتی بھی ساتھ ساتھ جلے گی اور جب بتی جلے گی تو اس کی روشنی اور تپش سے شیشہ بھی گرم ہوگا اور جب شیشہ گرم ہوگا تو جس طاق میں قندیل رکھا جائے گا اُس طاق میں بھی روشنی اور حرارت پہنچے گی۔ یہ طاق میرا جسم ہے۔ جس میں اللہ تعالٰی نے اپنے عشق کی قندیل روشن کر دی ہے۔ کبھی نگاہ روشنی کی جانب جاتی تو دل کی ٹھنڈک محسوس ہوتی کبھی تپش کی طرف ذہن لائل ہوتا تو عشق کی آگ میں تن من جلنے لگتا۔ اس دم میرا جی چاہتا، میرا وجود جل کر فنا ہو جائے۔ نہ یہ شیشہ رہے نہ یہ بتی رہے۔ سب کچھ اس تیل میں مل جائے۔ جس کے اندر روشنی بھی ہے اور حرارت بھی ہے۔ میرا جی چاہتا اس تیل میں چھپی ہوئی روشنی کو ڈھونڈ نکالوں۔ وہی تو اصل حقیقت ہے۔ ایک دن میرے ذہن میں آیا مجذوب کا بہت درجہ ہوتا ہوگا۔ مجھے مجذوبیت میں ایک کشش محسوس ہونے لگی۔ وہ مرشد ہی کہاں جو مرید کے دل کا حال نہ پہچانے۔ دوسرے دن شیخ احمد کی محفل میں شرکت ہوئی۔ آپ نے فرمایا "مجذوب وہ ہے، جو اللہ تعالٰی کے عشق میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ شعوری طور پر اس کی نفی ہو جاتی ہے"۔

ان دنوں ثمینہ اور راحیلہ کی شادی کا تذکرہ گھر میں موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ دونوں تھیں بھی ہم عمر۔ دونوں میں خوب دوستی تھی۔ دونوں نے ایک ہی کالج سے بی ایس سی کیا تھا۔ اب پاپا اور چچا کا

ارادہ آگے پڑھانے کا نہیں تھا کیونکہ اس سے زیادہ پڑھانے کا مطلب لڑکیوں کا پروفیشنل لائن میں جانا تھا۔ جبکہ گھر کے بڑوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کی اعلیٰ تعلیم ہونی ضروری ہے مگر ازدواجی زندگی میں گھریلو نظام کو بہتر بنانے کے لئے آئندہ آنے والی نسلوں کو صحیح طریقے سے تعلیم وتربیت کرنے کے لئے عورت کا گھر میں رہنا ضروری ہے تاکہ وہ اپنی پوری توجہ گھر کے کاموں اور بچوں کی نگہداشت پر دے سکے۔ میں نے تو پاپا اور چچا سے کہا تھا کہ دونوں لڑکیاں تعلیم میں اچھی خاصی جارہی ہیں انہیں ڈاکٹری پڑھا دیں مگر پاپا اور چچا دونوں نے بڑے پُر جوش اصرار کے ساتھ یہی کہا کہ آخر کو تو انہیں بچے ہی پالنے ہیں۔ پروفیشنل لائف میں تھک ہار کے جب گھر آئیں گی تو بال بچوں پر کتنا وقت دے سکیں گی۔ پھر میں نے بھی زیادہ زور نہیں دیا۔ میرے نزدیک تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے فضل کے ساتھ ساتھ بندے کا ارادہ اگر اس کے کاموں میں شامل ہو تو دنیا کا کوئی کام رکنے نہیں پاتا ہے۔ آدمی زندگی میں بیک وقت بہت سے کام بھی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے بشرطیکہ وہ کام کا بوجھ سر پر نہ لادے کیونکہ جب بوجھ سمجھا جاتا ہے تو مشکل کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اگر صرف ارادہ کرلیا جائے کہ یہ کام کرنا ہے اور بس تو پھر خود بخود اسباب ووسائل بنتے چلے جاتے ہیں اور سب کام روٹین میں ہونے لگتے ہیں۔ ویسے بھی ان دنوں دونوں لڑکیوں کے رشتے بھی کئی آرہے تھے۔ زیما کا بھی یہی خیال تھا کہ اچھے رشتوں کو لوٹا دینا ٹھیک نہیں ہے۔ آج کل روز شام کو چائے پر کسی نہ کسی کا انٹرویو ہوتا۔ تقریباً دو ماہ کی چھان بین کے بعد دو رشتے پسند آئے مگر فائنل منظوری تو شیخ کی ہونی تھی۔ ایک لڑکا کسی ڈرگ لیبارٹری کا منیجر تھا۔ اس کا نام محمد یامین تھا۔ دوسرا لڑکا لیدر گارمنٹس اور لیدر امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا تھا۔ دونوں کی تعلیم ایم ایس سی تھی۔ دوسرے کا نام ارسل جمال تھا۔ شیخ احمد نے دونوں کو دیکھا ان کے والدین سے ملے۔ دونوں رشتے پسند آئے۔ محمد یامین ثمینہ کے لئے اور ارسل جمال کو راحیلہ کے لیے پسند کردیا گیا۔ چند ہی دنوں میں دونوں کی منگنی کردی گئی مگر غم اور خوشی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دنیا کی رونق دونوں سے ہے۔ تین ماہ دونوں کی شادی کی تیاری میں گزر گئے۔ دونوں کی براتیں دو دن کے وقفے سے تھیں۔ میں نے بھی دو ہفتے کی چھٹی لی۔ قریبی تمام رشتے دار ایک ہفتہ پہلے آگئے تھے۔ نعمان اب تقریباً چھ سال کا ہو رہا تھا۔ اسے شادیوں میں بہت مزہ آیا۔ ویسے بھی اس عمر میں بچے کا تجسس ہر شے کے اندر جھانکنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر چیز میں دلچسپی لیتا ہے۔ میری پندرہ دن کی چھٹیاں شادی کے ہنگاموں کی نذر ہوگئیں مگر یہ بھی ایک بڑا کام تھا ثمینہ اور راحیلہ کی

شادی کر کے مجھے یہ احساس ہوا کہ واقعی جوان لڑکیوں کی شادی کا بوجھ بہت ہوتا ہے۔ یہ بھی ماں باپ کے کندھوں پر بڑی بھاری ذمہ داری ہے اگر ذمہ داری کا احساس نہ ہو تو قدرت کے بنائے ہوئے قانون پر عمل بھی نہ ہو سکے۔ قدرت نے جہاں قوانین بنائے وہاں انسان کے اندر ان قوانین پر عمل کرنے کی خواہش بھی پیدا کر دی تا کہ آدمی اپنے ارادے کے ساتھ ان پر عمل کر سکے اور کارخانہ کائنات اپنے قدرتی نظام کے ساتھ جانے والے کی رضا کے مطابق جاری و ساری رہے۔ میرا ذہن دن بدن اب کائناتی نظام میں کام کرنے والے اصولوں کی جانب متوجہ رہتا۔ ہر شئے میں کوئی نہ کوئی حکمت کارفرما دکھائی دیتی۔ جوں جوں اللہ پاک کے اسرار ذہن پر کھلتے جاتے توں توں اللہ کی محبت اور اس کا عشق سمندر کی لہروں کی طرح میرے اندر کروٹیں لیتا محسوس ہوتا۔ مجھے یوں لگتا جیسے میں بھی نعمان کی طرح ایک بچہ ہوں جو اللہ تعالیٰ کی ہستی میں جھانک جھانک کے بار بار دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے دل و دماغ پر ہر وقت یہی خیال حاوی رہتا کہ اللہ پاک کے کُن کہنے سے کائنات کس طرح ظہور میں آئی۔ میرا جی چاہتا میں کُن کے بعد کے تمام مظاہرات کا مشاہدہ کر لوں۔ کمپیوٹر کے علوم جاننے کی وجہ سے میرے ذہن میں ہر وقت کمپیوٹر کی پروگرامنگ کی طرح کُن کے نقشے بنتے رہتے حالانکہ اس موضوع پر شیخ احمد سے کافی علوم اور معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ قرآن تو میں تقریباً ہر روز ہی باترجمہ ضرور پڑھتا رہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ کے علوم تو لامتناہی ہیں میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی علم پر اگر ذہن رک جائے تو اس علم کے حاصل کرنے کی جستجو بھی ختم ہو جائے گی۔ تجسس ہی راستہ نکالتا ہے۔ اللہ پاک کے راستے میں کوئی منزل نہیں ہے کیونکہ اللہ کے راستے کی منزل خود اللہ کی ذات ہے۔ اللہ کی ذات لامحدود و لامتناہیت ہے۔ لامحدودیت کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا بس جہاں بندہ تھک کر بیٹھ جاتا ہے، وہی اس کی منزل قرار پا جاتی ہے۔ میرے دل کی گہرائیوں سے روح کی صدا بلند ہوتی۔ اے میرے رب! میری ناتوانی کے پاؤں میں ایسی ہمت عطا فرما کہ یہ تیری لامحدودیت میں تیری توانائی کے ساتھ چلتے رہیں۔ ان کیفیات میں میرے سامنے ملاءِ اعلیٰ آ جاتے۔ ملائکہ کا شعور آدمی کے اندر ملکوتی صفات پیدا کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے کائناتی نظام میں کام کرنے والی حکمتوں کو وہ سمجھنے لگتا ہے اور مشاہدہ بھی کرنے لگتا ہے۔ ایک دن مراقبہ میں یوں دیکھا کہ ملاءِ اعلیٰ کے سینے کے اندر نظر دیکھ رہی ہے۔ یہ سینہ نور کا ایک پردہ ہے۔ آسمان کی طرح وسیع۔ اس پردے پر کائناتی اشیاء کے فارمولے لکھے ہیں جیسے سائنسی فارمولے لکھے ہوتے ہیں۔ میں انہیں بہت غور سے دیکھ کر یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

شیخ احمد سے ان کیفیات و مشاہدات کا ذکر کیا۔انہوں نے فرمایا ملاء اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے تفکر کی تجلی ہے۔راہِ طریقت میں چلتے چلتے سالک کا ذہن جب اللہ تعالیٰ کے تفکر میں جذب ہو جاتا ہے۔تو ملاء اعلیٰ سے رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔یہ علوم براہِ راست تربیت وتعلیم کا ایک حصہ ہے۔براہِ راست تربیت وتعلیم میں انسان کے ارادے اور عمل کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ براہِ راست تعلیم وتربیت کا مطلب یہ ہے کہ سالک کے ذہن کی توانائی جب اللہ تعالیٰ کی تجلی بن جاتی ہے دوسرے لفظوں میں جب سالک کا ذہن تجلی کے انوار جذب کر کے اس توانائی سے حرکت کرتا ہے تو اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی تجلی کو سمجھنے اور پہچاننے کی صلاحیت فطری طور پر کام کرنے لگتی ہے۔ایسی صورت میں سالک کا ذہن تجلی کے انوار کو جذب کرنے کی وجہ سے تجلی کی طرح روشن اور شفاف ہو جاتا ہے اور اس شفاف آئینے میں اللہ تعالیٰ کے علوم کا عکس پڑتا ہے۔یہ عکس اللہ تعالیٰ کے وہ علوم ہیں جو کُن کے بعد لوحِ محفوظ کے پردہ پر ظاہر ہوئے۔جب روح کی نظر اپنے باطن میں اس عکس کو دیکھتی ہے تو اس وقت اس لمحۂ کُن پر اللہ تعالیٰ کا یہ تفکر غالب ہوتا ہے۔کہ ہم نے آدم کے اندر اپنے روح پھونکی۔روح چونکہ اللہ کی ہستی کا ایک جزو ہے اس وجہ سے آدم کی ذات کو عطا کئے جانے والے علوم اللہ تعالیٰ کی صفات کے علوم ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اللہ پاک کی ذات اور آدم کی ذات کے درمیان کوئی تیسری ہستی نہیں ہے۔اللہ کے ساتھ براہِ راست جس روح کا رابطہ ہے وہ روح ذاتِ باری تعالیٰ کی تجلی ہے۔یہ روح، روحِ اعظم کہلاتی ہے۔جب راہِ طریقت پر چلتے ہوئے سالک کا تفکر روحِ اعظم کا شعور بن جاتا ہے تو اس کا رابطہ باری تعالیٰ سے ہو جاتا ہے۔یہ رابطہ روحِ اعظم کے ذریعے ہوتا ہے یعنی ذات کی تجلی اللہ اور بندے کے درمیان حجاب بن جاتی ہے اور اللہ اپنے بندے کو جو کچھ بھی دکھانا چاہتا ہے وہ اپنی تجلی کے حجاب میں دکھا دیتا ہے۔یہ حقیقت کا وہ عالم ہے جس میں بندے کے کسی عمل اور ارادے کو دخل نہیں ہے۔اس کی معرفت صرف اللہ تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے۔اس معرفت کا حصول قربِ فرائض میں شمار ہوتا ہے۔قربِ نوافل وہ راستہ ہے جس میں سالک اللہ کے راستے پر اپنے ارادے اور اپنی کوششوں کے ساتھ جدوجہد کرتا ہے اور جدوجہد کے نتیجے میں اللہ پاک اسے اس کی کوششوں کا صلہ عنایت کرتے ہیں پھر مجھے شیخ احمد نے بہت سی دعائیں دیں کہ اللہ پاک تمہیں اپنے قرب کی بہترین نعمتوں سے نوازے۔

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے خوشیاں میرا نصیب بن گئی ہیں۔سچ تو ہے خوشیاں تو ہر انسان کا نصیب ہیں۔اللہ پاک نے آدم اور حوا کو پیدا کر کے سب سے پہلے جنت میں رکھا۔جنت جو خوشی کا مقام

ہے۔اللہ نے آدم وحوا کے لئے یہی تو چاہا تھا کہ آدم وحوا جنت میں خوش خوش رہیں، عیش کریں، اللہ کا چاہنا ہی تو میرا مقدر ہے۔ میں اللہ کے چاہنے سے ہٹ کر اور کسی کے تفکر کو اپنا مقدر ہرگز نہیں بناؤں گا۔ اگر دنیا میں مجھے غم اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس کے اندر غم اور تکلیف کے معنی میں نے پہنائے ہیں کیونکہ میں نے اپنے آپ کو جنت سے الگ کرلیا ہے۔اگر میں پھر سے اپنا ذہن جنت کے ساتھ جوڑ دوں اور اللہ پاک کے اس تفکر کے ساتھ جوڑ دوں کہ ہم بندے کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو غم کے لمحات پر بھی تفکر کا سایہ رہے گا اور غم مقدر پر حاوی نہیں ہونے پائے گا۔میری خوشی اللہ سے ہے۔میرا مقدر اللہ کا تفکر ہے۔اللہ کی ذات اور اس کا تفکر سدا باقی رہنے والا ہے۔میرا جی چاہتا ہے میں ہواؤں میں اُڑ جاؤں۔فضاؤں میں لہریں بن کر بکھر جاؤں۔خوشیوں بھری اس جنت میں ناچوں گاؤں۔

جب بندہ اللہ کے تفکر سے ناتا جوڑلیتا ہے تو اس کے مقدر کو اس کی نعمتیں ملتی رہتی ہیں۔میرے مقدر کی جھولی کو بھی اللہ پاک نے اپنی بہترین نعمت سے بھر دیا۔آدم کے تفکر کا جمال افشاں کے روپ میں نزیما کی گود میں جگمگانے لگا۔جنت کا ایک اور باسی ملکِ عدم کی سیاحت میں عازمِ سفر تھا۔افشاں ہو بہو نزیما کی صورت تھی۔ممی اور چچی کے اس سونے پن کو جو راحیلہ اور ثمینہ کے جانے سے تھا، افشاں کی آمد نے بہت حد تک دور کر دیا۔نعمان بھی ننھی بہن کو بہت پیار کرتا مجھے اپنے دامن کی ہر خوشی مرشد کی دعاؤں کا ثمر دکھائی دیتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے میں اللہ کے سائبان تلے موسم کے سرد وگرم سے محفوظ بیٹھا ہوں۔

ایک رات میں چھت پر بنے کمرے میں بیٹھا مراقبہ کر رہا تھا۔اب میں عام طور سے یہیں پر مراقبہ کرتا تھا تاکہ ننھی افشاں کے وقت بے وقت رونے کی آواز مخل نہ ہو۔مراقبہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ کانچ کا ایک پتلا ہے۔اس پتلے میں اللہ میاں اپنی روح پھونک رہے ہیں۔کانچ کا پتلا ایک خول ہے جیسے خالی مرتبان۔میری نظر اس سارے عمل کو دیکھ رہی ہے۔اللہ تعالٰی کی پھونکی ہوئی روح ایک رنگ کی روشنی کا دائرہ ہے۔پھونک پتلے کے اندر جیسے جیسے جاتی جا رہی ہے رنگین روشنی کے دائرے بنتے چلے جا رہے ہیں۔میری نظر اور میرا انہماک ان رنگین دائروں پر ہے۔پتلے کے اندر یہ دائرے آپس میں مل کر رنگین خوشنما ڈیزائن بنا رہے ہیں۔پتلا دیکھتے دیکھتے اتنا بڑا لگا جیسے ساری کائنات اور اس پتلے کے اندر اللہ کی پھونکی ہوئی روح سے رنگین روشنی کے دائروں سے جگہ جگہ کائنات کی اشیاء تصویریں بن گئیں۔ جب پتلا ان تصویروں سے بھر گیا مجھے یوں لگا جیسے روح پھونکی جا چکی ہے۔اب اس کانچ کے پتلے کے

اندر روشنیاں اوران کے اندر کے نقش و نگار پر میری نظر اسی طرح انہماک سے دیکھتی رہی ۔ بہت دیر تک یہ انہماک قائم رہا۔اس کے ساتھ ساتھ ایسا محسوس ہوا جیسے کانچ کے پتلے کے اندر کے نقش و نگار روشن ترین ہوتے جا رہے ہیں اور جس طرح طلوعِ آفتاب کے بعد آفتاب کی تمازت درجہ بدرجہ بڑھتی جاتی ہے ۔نقش و نگار کی روشنی بھی بڑھتی جا رہی ہے ۔ یہاں تک کہ نقش و نگار کی روشنیاں کانچ کے پتلے کے باہر نکل آئیں اور کانچ کے پتلے کا ہو بہو ایک عکس اس کے مقابل میں آ گیا ۔میرے ذہن میں آیا یہ عکس آدم کے اندر پھونکی جانے والی روح کا مظاہرہ ہے ۔آدم کے اندر پھونکی جانے والی روح اللہ کے علوم ہیں اور اللہ کے علوم کا مظاہرہ آدم کائنات میں کر رہا ہے ۔ مجھے یوں لگا کہ ساری کائنات کی صورتیں آدم کے اندر پھونکی جانے والی روح کے ادراک کی شکلیں ہیں ۔اللہ کے نور کی کوئی صورت نہیں ہے مگر یہ نور جب آدم کے پتلے میں داخل ہوا تو آدم کا پتلا اس نور کی ظاہری صورت بن گیا اور کُن کا وہ لمحہ جس لمحے روح پھونکی گئی اس لمحے کا ہر یونٹ آدم کی روح کا ادراک ہے ۔پتلے کے بغیر آدم کا تصور نہ تھا اور جب آدم کا تذکرہ نہیں تھا تو آدم کے ادراک کا بھی تذکرہ بھی نہ تھا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ روح کا ادراک آدم کے پتلے کے حواس ہیں ۔روح کے حواس کی درجہ بندی کا نام کائنات ہے اور کائنات کی ہر صورت روحِ اعظم کے حواس کی ایک صورت ہے ۔جیسے ازل کے لمحے میں جب آدم کے پتلے میں اللہ تعالیٰ نے روح پھونکی تو آدم کے پتلے کے اندر خوشی کا تفکر یا شعور پیدا ہوا۔اس شعور یا تفکر نے روحِ اعظم کے تصور میں جنت کا نقشہ تعمیر کر دیا ۔روحِ اعظم کے دماغ نے اللہ تعالیٰ کی پھونکی ہوئی روح کو صورت بخش دی ۔ یہ صورت کائنات ہے اور یہ روحِ اعظم حقیقت محمدیؐ ہے ۔ جو نورِ اول ہے جو باعثِ کائنات ہے جس کے لئے اللہ پاک فرماتے ہیں ۔اے محبوب اگر آپ نہ ہوتے تو کائنات بھی نہ ہوتی ۔حقیقتِ محمدیؐ یا روحِ اعظم ذاتِ خالق کی تجلی ہے ۔اس تجلی کے اندر اللہ تعالیٰ نے خود اس کی اپنی ذات کا شعور پیدا کر دیا یہی شعور اللہ تعالیٰ کی پھونکی ہوئی روح ہے ۔حقیقتِ محمدیؐ کے درجے میں اس روح کا تعلق براہِ راست ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے ۔روحِ اعظم کا شعور معرفتِ ذات کے علم ہیں ۔کائنات کی روحِ اعظم یا حقیقتِ محمدیؐ کا شعورِ اول اللہ تعالیٰ کا امر ہے ۔اس امر کی حرکت سے کائنات کے نقش و نگار کی صورتوں میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے ۔آدم یا انسان روحِ اعظم یا شعورِ اول کا ایک مکمل یونٹ ہیں ۔ دنیا میں رہتے ہوئے جب کوئی مرد یا عورت اپنے اندر روحِ اعظم کے شعورِ اول کو بیدار اور متحرک کر دیتا ہے تو عملی طور پر اور شعوری طور پر وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق کائنات کی تسخیر کر لیتا ہے ۔ ذہن کی

اس ساری تشریح کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں ۔ذہن بالکل خالی تھا۔نظریں سامنے جم گئیں مجھے یوں لگا جیسے کوئی چیز میری جانب بڑھ رہی ہے ۔بس یہ ایک شدید احساس تھا کہ کوئی میری جانب بڑھ رہا ہے مگر ذہن بالکل خالی تھا کیا ہے پتہ نہ تھا ۔بے اختیار میرے بازو اس طرح بڑھ گئے جیسے کسی کو گلے لگاتے ہیں اور یوں لگا کہ روحِ اعظم میرے اندر داخل ہوگئی ہے ۔تھوڑی دیر بعد اندر کا سارا جسم مرکری روشنی کا تھا اور جب باہر نظر پڑی تو یوں لگا جیسے میرا جسم جلد کے رنگ کے کپڑے کا ہے ۔بہت نرم و ملائم پتلا ریشم جیسا کپڑا باہر سے جسم جلد کے رنگ کا ہے اور اندر سے روپہلی نہایت چمکدار ہے یعنی اس کپڑے کی باہر کی سطح جلد کی ہے ۔اندر کی سطح روپہلی ہے، چمکدار ہے ۔

میں نے اللہ پاک سے دعا مانگی کہ اللہ پاک میرے ذریعے سے لوگوں کو شفاء اور سکون بخشے ۔

افشاں ابھی دو ماہ کی تھی کہ وقاص بھائی کی شادی طے پا گئی ۔لڑکی کا نام سدرہ تھا ۔یہ لوگ بہت عرصے سے پڑوس میں بس رہے تھے ۔اچھے لوگ تھے ۔شادی پر زیما دونوں بچوں کے ساتھ دو ہفتے پہلے چلی گئی ۔میں شادی سے ایک دن پہلے ممی پاپا، چچی چچا کے ساتھ پہنچا ۔ثمینہ اور راحیلہ بمع اپنے شوہروں کے آگئی تھیں ۔سارا خاندان اکٹھا ہو تو مزہ بہت آتا ہے ۔شادی کے دوسرے دن ولیمہ تھا ۔تیسرے دن میں تو چلا آیا ۔آفس سے چھٹی اتنی ہی تھی ۔باقی گھر والے ایک ہفتے بعد زیما کے ساتھ واپس آئے ۔ابھی وقاص بھائی کی شادی کو مشکل سے چار ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ اطلاع آئی کہ زیما کے ابو کو ہلکا سا دل کا دورہ پڑا تھا مگر جلد ہی ٹھیک ہو گئے ۔ہم سب اس خبر سے سخت پریشان ہوئے ۔خصوصاً زیما تو بہت ہی پریشان ہوئی ۔چند دن تک روزانہ اپنے ابو سے فون پر باتیں کرنے کے بعد پھر اس کی فکر دور ہوئی ۔ہم سب جلد ہی اس واقعہ کو بھول گئے ۔تقریباً دو ہفتے بعد سدرہ بھابھی کا فون آیا ۔ابو کو دوبارہ دورہ پڑا ہے فوراً ہسپتال لے گئے ہیں ۔یہ سنتے ہی زیما کو لے کر فوراً ہی ہوائی جہاز میں روانہ ہو گئے ۔دونوں بچوں کو ممی نے رکھ لیا کہ اپنی پریشانی میں بچوں کی جانب توجہ نہ دی جا سکے گی ۔شیخ احمد سے بھی دعا کی درخواست کی گئی ۔ہم سب اللہ کے حضور ان کی زندگی کی دعائیں کرتے رہے ۔اس رات میں چھت پر مراقبہ روم میں جا بیٹھا ۔دل بڑا بے چین تھا ۔عتیق پھوپھا تھے بھی بہت محبت کرنے والے ۔صحت بھی ان کی ہمیشہ سے اچھی خاصی رہی ۔یہ اچانک کیسے ہو گیا ۔میں نے اس اضطراب میں جاء نماز بچھائی وضو کر کے اس پر بیٹھ گیا اور یا حی یا قیوم کا ورد آنکھیں بند کر کے کرنے لگا ۔کمرے میں بہت ہی ہلکا زیرو پاور کا نیلی روشنی کا بلب جل رہا تھا ۔میں نے پوری توجہ پھوپھا کی جانب لگا دی ۔دل میں یہی ارادہ تھا کہ اللہ پاک انہیں

شفائے کلی اور لمبی عمر دے۔ چند لمحوں بعد ہی میں الہامی کیفیات میں پہنچ گیا۔

میں نے دیکھا کہ پھوپھا کے جسم پر غشی طاری ہے۔ جیسے گہری نیند میں ہوں، وہ بستر پر لیٹے ہیں۔ یہ بستر ایک فضا میں ہے۔ بس یہ ایک اسپیس تھی۔ اس اسپیس میں سامنے سے ایک بیم لائٹ آئی بہت موٹی اور روشن شعاع تھی۔ اس لائٹ نے یا شعاع نے پھوپھا کو مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچنا شروع کر دیا۔ اب صورتِ حال یوں تھی کہ پھوپھا کے سینے سے شعاع جیسے چپکی ہوئی تھی اور سینے کے بالکل سیدھ میں تھی۔ مجھے محسوس ہوا شعاع بہت دور سے آ رہی ہے۔ کہاں سے آ رہی ہے یہ جاننے کے لئے میں شعاع کی سیدھ میں دور تک دیکھتا رہا۔ شعاع حدِ نگاہ پر ایک روزن سے آ رہی تھی۔ بہت ہی دور سے اب پھر توجہ پھوپھا کی جانب گئی۔ شعاع مقناطیس کی طرح انہیں کھینچ رہی تھی مگر رفتار بہت ہی آہستہ تھی۔ پھوپھا غش یا نیند میں تھے وہ بس کھنچے جا رہے تھے۔ ان کا جسم نیند والے جسم کی طرح بے بس تھا میں دوڑ کر جلدی سے پھوپھا کے پاس آ گیا۔ ان کے بازو پکڑ کر انہیں سہارا دیا۔ مجھے محسوس ہوا وہ ایک دم سے بے ہوش نہیں ہیں بلکہ صرف بات نہیں کر سکتے مگر انہیں اپنے کھنچے جانے کا علم ہے اور ان کے چہرے پر خوف کے آثار ہیں۔ میں انہیں بازوؤں سے سنبھالے رہا اور مسلسل انہیں تسلی دیتا رہا کہ آپ موت کا سفر طے کر رہے ہیں۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ سفر بہت جلد طے ہو جائے گا۔ آپ بہت جلد اپنے مقام پر پہنچ جائیں گے۔ یہ بے بسی و ناتوانی کی حالت جلد ختم ہو جائے گی۔ میں پھوپھا کو سہارا دے کر سب کچھ کہا جا رہا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ میں الہامی کیفیات میں تھا اور اس کیفیت میں روحانی اور جسمانی دونوں حواس کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں بھی پھوپھا کے ساتھ ساتھ یہ موت کا سفر طے کر رہا ہوں۔ جو جو کیفیات اور حالت پھوپھا کی ہیں وہ ساری کیفیات میری روح اور میرے جسم پر طاری ہیں۔ بس صرف مجھے خوف نہ تھا بلکہ میرا ذہن خالی تھا جیسے بس کیفیات گزر رہی ہیں مگر ان کے اچھے بُرے خوشی غم کا کوئی تصور نہ تھا۔ نہ جانے کتنی دیر اس سفر میں گزر گئی۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے بھی زیادہ۔ میں انہیں سہارا دے کر آگے بڑھائے جاتا وہ لڑکھڑا کر گرنے لگتے میں پھر پوری قوت سے انہیں سہارا دیتا بس پھوپھا کے ساتھ اس وقت ایک شدید محبت کا احساس تھا اور یہی احساس میری قوت بنا ہوا تھا۔ میری کوشش تھی کہ پھوپھا کے سینے سے شعاع ہٹنے نہ پائے ورنہ پھوپھا وہیں رہ جائیں گے۔ شعاع ٹوٹ جائے گی۔ پھوپھا نے آگے جانا ہے میری خواہش ہے کہ پھوپھا آگے جائیں۔ یوں لگا جیسے ہم اسپیس میں عالمین سے گزر رہے ہیں۔ میں تھوڑی دور اور تھوڑی دور اور کہہ کر ان کی

ہمت بڑھائے جاتا۔ ان پر موت کی ناتوانی غالب تھی۔ ان کا جسم بالکل مفلوج تھا اور ان پر شدید تھکن طاری تھی غالباً دو گھنٹے بعد ہمارے سامنے آسمان آ گیا۔ یہ ایک بلندی تھی۔ اس بلندی پر جو فضا میں تھی اور اس کا احساس آسمان کا تھا کہ یہ آسمان ہے۔ اسی لمحے میری الہامی کیفیت ٹوٹی میرا جسم ناتوانی سے کانپ رہا تھا۔ آنسو بہہ رہے تھے میں سجدے میں گر کر رونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ذرا طبیعت سنبھلی تو نیچے اترا۔ طبیعت پر اس قدر اضمحلال تھا کہ مجھے خود حوصلے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں سیدھا ممی کے کمرے میں گیا۔ ممی پلنگ پر ٹیک لگائے بیٹھی تھیں میں جاتے ہی ان کی آغوش میں گر گیا اور گود میں منہ چھپا کر رو پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ میری پشت پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ میں نے روتے روتے کہا ممی پھوپھا ہمیں چھوڑ گئے۔ ممی نے پوچھا کیا فون آیا تھا۔ میں نے کہا نہیں میں نے دیکھ لیا ہے۔ ہم دونوں ہی رونے لگے۔ چند منٹ بعد ہی فون کی گھنٹی بجی۔ سدرہ بھابھی کے والد کی آواز تھی۔ ہم پہلے ہی اس اطلاع سے باخبر تھے۔ صبح ہم سب پنڈی پہنچے اور تیسرے دن سوئم کے بعد لوٹ آئے۔ زریما بچوں کے ساتھ وہاں کچھ دن کے لئے ٹھہر گئی۔ میں نے آتے ہی شیخ احمد کو اس رات کی کیفیات سے آگاہ کیا۔ کہتے کہتے میں ہچکیوں سے رو پڑا۔ وہ بہت تحمل سے مسکرا دیئے۔ کہنے لگے۔ آپ کو پتہ نہیں ہے کہ آپ کتنے بڑے مرحلے سے گزرے ہیں۔

پھوپھا کے چالیسویں کے بعد زریما واپس آ گئی۔ چالیسویں پر ہم سب ہی وہاں گئے تھے۔ ساتھ ہی واپس آئے۔ ایک عجیب اداسی تھی۔ زریما کا سوگوار چہرہ دیکھ کر میرے دل پر چھریاں چلنے لگتی تھیں۔ اکثر راتوں کو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوتا۔ مجھے دادی اماں کا اس دنیا سے جانا یاد آ جاتا۔ میں سوچتا ہم انسان بھی ایک زنجیر کی طرح ہیں کہ ہر آدمی دوسرے آدمی سے کڑی کی طرح منسلک ہے۔ جب یہ کڑی ٹوٹتی ہے تو زنجیر کے سامنے حلقہ آ جاتا ہے۔ دل اس کڑی کو ڈھونڈنے لگتا ہے تاکہ پھر سے ایک ہو جائے۔ آدمی اس حلقے میں پھر کوئی کڑی جوڑ دیتا ہے تاکہ زندگی کی زنجیر میں تسلسل قائم ہو جائے اور زندگی رواں دواں رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دلوں کے زخم مندمل ہو ہی جاتے ہیں۔ چند مہینوں میں گھر کی رونقیں پھر سے لوٹ آئیں۔ اب پھوپھا عتیق کے ذکر پر سب یہی کہتے نیک آدمی تھے۔ ان کی زندگی بھی نہایت پُرسکون گزری۔ بچوں کی ذمہ داریوں سے بھی اپنی زندگی میں سبکدوش ہو گئے۔ موت بھی تکلیف دہ نہ تھی۔ اللہ سب کا ایسا ہی معاملہ کرے۔ میں پھوپھا عتیق کی زندگی پر غور کرتا تو اس میں دو باتیں نمایاں دکھائی دیتیں۔ ایک اطاعت دوسری محبت۔ اطاعت گزاری میں پورے خاندان میں کوئی

بھی ان کا ہم سر نہ تھا۔ بڑی آسانی سے سب کی بات مان لیتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی محبت بھی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس محبت کی بناء پر وہ کچھ اس انداز سے اپنے آپ کو دوسرے کے حوالے کر دیتے کہ دوسرا خود بخود ان کے ذہن کی پسند کی بات کرتا اور ساتھ ہی میں ان کا شکر گزار بھی ہوتا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہماری زندگی سے وابستہ ہر فرد ہماری کتابِ زندگی کا ایک سبق ہے۔ قدرت نے اپنا علم کائنات کے ذرے ذرے پر لکھ دیا ہے۔ پڑھنے والی نظر اور سمجھنے والا ذہن ہونا چاہیئے۔

ایک مجلس میں شیخ احمد نے فرمایا۔ ذات باری تعالیٰ نے اپنے بندوں کی تخلیق اس وجہ سے کی ہے تا کہ اس کے بندے ذاتِ خالق کو اس کی تمام تر صفات اور کمالات کے ساتھ پہچان لیں اور یہی کمالات وصفات اور شعائر اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء ہیں جن کے علوم آدم کو عطا کئے گئے ہیں۔ یہ اللہ پاک کے وہ خزانے ہیں جن کے ساتھ وہ آپ کی محبت وتلاش میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ خود ذات اس کا ادراک بن جاتی ہے۔ مگر اس طرح آدم کو خلیفۃ اللہ کہنے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اللہ پاک نے آدم کو اسمائے الٰہیہ کے علوم اس وجہ سے دیئے تا کہ آدم کائنات کی دوسری مخلوق کے سامنے اس کے عطا کردہ علوم وصلاحیتوں کا مظاہرہ کرے اور زمین پر اللہ پاک کی پاکی اور عظمت بیان کرے تا کہ مخلوق اپنے رب کو پہچان جائے۔ جیسا اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اور تمام آسمانی کتابوں میں جتنے بھی پیغمبران علیہ السلام کے تذکرے آچکے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی پیغمبر مجذوب نہ تھا۔ بلکہ تمام پیغمبروں کی یہی تعلیم رہی ہے کہ اپنی روح کا عرفان حاصل کرو۔ روح ہی تمہارا اصل نفس ہے۔ جس کا رابطہ براہِ راست اللہ پاک سے ہے۔ اگر تمہاری روح تمہارے سامنے آگئی تو تم اس رابطے کو بھی دیکھ لو گے جس کے ذریعے روح اپنے رب سے منسلک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی اس لائق ہے کہ اس کی تعریف بیان کی جائے۔ اس نے اپنی مخلوق میں سے آدم کو چن لیا ہے کہ آدم اس کی صفات کو دیکھ کر اس کی ذات میں اس کی تعریف بیان کرے اور وہ ذاتِ حق اپنی عطا وکرم کے ساتھ آدم کو نوازتا رہے۔ مرشد بھی نہیں چاہتا کہ اس کا مرید مجذوب ہو جائے کیونکہ اس طرح وہ عطا کردہ علوم سے عام لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔

شیخ احمد کی تقریر سن کر میں اندر ہی اندر اپنے خیال کی کمزوری پر پشیمان تھا اور شیخ احمد کا شکر گزار تھا کہ انہوں نے بروقت میری اصلاح فرمائی۔ دل کہنے لگا میرے لئے تو سب کچھ وہی ہیں۔ انہیں کے

ساغر کی چھلکتی شراب نے میرے ہاتھوں کو بڑھنے پر مجبور کر دیا ہے۔انہیں کی شراب کے خمار نے مجھے میخانے میں مدمست کر دیا ہے کبھی نظر ساغر کی رنگینی کو دیکھتی ہے اور کبھی نگاہ شراب کی مستی میں ڈوب جاتی ہے۔وہ شراب معرفت کا میخانہ ہیں اور میں بادہ رنگین کا میخوار ہوں۔نہ میخانہ کبھی خالی ہوگا نہ میخوار کبھی سیر ہوگا۔دونوں کی نگاہ ایک دوسرے پر ہے۔

لا پلا دے ساقیا پیمانہ پیمانے کے

بعد

عقل کی باتیں کروں گا ہوش آ

جانے کے بعد

عجیب بات ہے معرفت کی اس رنگین شراب میں آج سارا عالم ڈوبا دکھائی دیتا ہے۔میرے اندر کا رند پکار پکار کے کہتا ہے یہ کیسی بات ہے کہ شراب تو میں نے پی ہے اور سارا میخانہ مستی میں بہکا ہوا ہے۔میرے گھر کا ہر فرد کیف و بے خودی کی باتیں کرتا ہے۔نزیما آسمان سے اتری اپسرا کا روپ ہے اور ننھا نعمان وہ تو بھولی بھالی فطرت کی ہو بہو تصویر ہے۔کس کس سے نظر ملاؤں۔کس کس پر جان دوں۔اے جانِ عالم! یہ کائنات تیری جان ہے۔اے نرگسِ مستانہ! تو عاشق کی نظر ہے۔تیری ہر نگاہ کائنات کے ذرے ذرے میں اپنے محبوب کا نظارہ کرتی ہے۔یہ راز میں نے خود عاشق بن کے پا لیا ہے۔آج میں فطرت کا عاشق ہوں۔وہ فطرت جو ذرے ذرے کے اندر جان بن کر سمائی ہوئی دکھائی دے۔ان کے ہاتھ میں رنگ کا ڈبہ تھا اور وہ دریا کی تہہ میں یہ رنگ انڈیل رہی تھیں۔دریا کے پانی میں ان کے انڈیلے ہوئے رنگ جذب ہوتے جا رہے تھے۔میرے وجود کا پیرہن ان کے رنگوں میں رنگ گیا۔میرا انگ انگ کھِل اٹھا۔

ان دنوں میرا عجیب حال تھا۔ مجھے یوں لگتا جیسے میں نے ایسا چشمہ پہن رکھا ہے جس سے دیکھنے پر نظر ہر شئے کے باطن میں پہنچ جاتی ہے۔جس شئے کی طرف نظر جاتی یوں لگتا جیسے وہ شئے مٹی کی نہیں بلکہ نور کی بنی ہے۔میں گھبرا کے اپنی نگاہ نیچی کر لیتا۔میرا منا میرا ننھا نعمان جیسے نور کا حسین شاہکار، میری خوشی، میری تمنا نزیما جیسے عالمِ نور کی ڈھلی ہوئی مورتی اور ایک دن جب میں کمرے میں تنہا تھا۔ اس دن تو حد ہوگئی۔کام کرتے کرتے اچانک زمین کی طرف نظر گئی۔ساری زمین نور اللہ ہے۔اب میں کبھی گھبرا کے اپنا پاؤں زمین سے اوپر اٹھاتا ہوں تو دوسرا پاؤں نور پر دکھائی دیتا ہے۔اب اس کو اٹھاتا

ہوں تو پہلا پاؤں زمین پر رکھنا پڑتا ہے۔ مجھے بے ادبی کا شدید احساس تھا۔ اب گھبرا کے میں نے پاس ہی کرسی پر اپنے آپ کو پھینک دیا کیونکہ میری تمام حرکات شدید طور پر اضطراری تھیں۔ دل سے آواز آئی کرسی جس پر تم بیٹھے ہو وہ بھی تو اللہ کے نور پر ہے۔ میں اس آواز پر اچھل کر ایک دم میز پر چڑھ گیا۔ اب پھر آواز آئی کیا میز اللہ کے نور پر نہیں ہے؟ بس یہ سننا تھا کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے رو کر کہا تو پھر میں کہاں جاؤں اور اس کے ساتھ ہی میرے لبوں پر مرشد کا نام آ گیا۔ دل کی آواز آئی۔ اپنی ہمت سے باہر قدم نکالو۔ میں اب آہستہ آہستہ نیچے اترا۔ میرے اندر اضطراری کیفیات میں ٹھہراؤ آ گیا۔ میں آرام سے فرش پر اس طرح کھڑا ہوا جیسے فرش شیشے کا ہے ٹوٹ نہ جائے اور نہایت ہی ادب سے میں نے ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر اللہ پاک کی بارگاہ میں عرض گزاشت کی: یا رب العالمین بلا شبہ تیرا نور کائنات کی ہر شئے پر محیط ہے اور تیرا نور ہی ہر شئے کی اصل ہے۔ کائنات کی کوئی شئے تیرے نور سے باہر نہیں نکل سکتی۔ پس مجھے ہمت و استقامت عطا فرما کہ میں تیرے نور کی تعظیم اس طرح کر سکوں جیسا تیرے نور کی تعظیم و تعریف کا حق ہے۔ پھر میں فرش پر سجدے میں گر گیا۔ پھر میری یہ مستقل عادت بن گئی۔ اکثر و بیشتر جب بھی ذہن میں نور کا خیال آتا نظر نور میں پہنچ جاتی۔ خاص طور سے یہ تو اکثر ہی ہوتا کہ جب بھی نہانے کے لئے شاور کھولتا نور کی بوندیں گرتیں نظر آتیں اور اس میں نہانے کا کچھ اور ہی لطف ہوتا۔ اس عادت کی وجہ سے ہر لمحے نحن اقرب الیہ من حبل الورید کا احساس رہتا۔

مجھ پر جو بھی احساسات و کیفیات گزرتیں۔ میں ان کے متعلق نزیما سے ضرور گفتگو کر لیتا۔ اس سے نزیما کا ذہن بھی روحانی طرزِ فکر پر آہستہ آہستہ نشو و نما پا رہا تھا۔ دوسرے راہِ سلوک میں جب غیر معمولی مکاشفات کا مشاہدہ و احساس ہوتا تو ایسے میں نزیما میرے لئے ایک ایسا سائبان بن جاتی جس کے نیچے مجھے دھوپ سے تحفظ کا احساس ہوتا۔ وہ ہر قدم پر حوصلہ اور ہمت سے گزر جانے میں میری پوری پوری مدد کرتی۔ کبھی میرے بالوں میں اپنی نرم و نازک انگلیاں پھیر کر روشنیوں کے دباؤ کو کم کرتی۔ کبھی میرا جسم دبا کر مجھے حوصلہ دلاتی۔ ایسے ہی وقت میں ایک مرتبہ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میاں بیوی کے اندر ذہنی ہم آہنگی راہِ سلوک پر چلنے میں کتنی آسانی پیدا کر دیتی ہے اور شعور میں انوار کے جذب ہونے سے شعور کے بیلنس کو برقرار رکھنے میں کتنی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

نماز فجر کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا تو مجھے یوں لگا جیسے یہ ہاتھ میرے نہیں ہیں۔ یہ ہاتھ نور کے بنے ہوئے ہیں۔ نظر ہاتھوں پر جمی تھی۔ مگر دل ان کے اندر نور کو دیکھ رہا تھا۔ نور جو اللہ ہے، نور کے

ہاتھ نے نور کی زمین سے مٹھی بھری اور مٹھی دبا کر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر وہ نور رکھ دیا۔نور کا ایک پتلا ہتھیلی پر کھڑا تھا۔اس ہاتھ پر پتلے کو اپنے لبوں سے لگایا اسے چوما اور وہ پتلا چلنے لگا۔اس کے لبوں کا لمس میرے لبوں پر محسوس ہوا۔ادراک گہرا ہو کر احساس میں منتقل ہو گیا۔احساس کی سطح پر بھونچال آ گیا۔ میں انتہائی ضبط کے باوجود بھی چیخ پڑا۔چلا کر رونے لگا۔اسی وقت زیما دوڑی آئی۔میں بے اختیاری میں زور زور سے بولنے لگا اور اپنی کیفیات کو رو رو کر دہرانے لگا۔اس نے مجھے اپنے سے قریب کیا۔ میری پشت پر آہستہ آہستہ سہلا سہلا کر نہایت ہی تسلی بخش الفاظ کہتی رہی۔کہنے لگی یہ تو آپ پر اللہ کا بہت ہی بڑا کرم ہے، فضل ہے، بھلا اس کے فضل کا کوئی عام آدمی برداشت کرنے کی سکت رکھ سکتا ہے۔آپ میں سکت ہے جبھی تو اللہ آپ کو یہ خصوصی علوم عطا فرما رہا ہے۔آپ سے اللہ پاک انتہائی محبت رکھتے ہیں۔محبت کرنے والے کو قربت ہی عطا ہوتی ہے۔اس کی قربت کی سکت ہر کوئی نہیں رکھ سکتا اس کے الفاظ اور اس کا لمس اس لمحے میرے لئے قدرت کا سب سے بڑا انعام تھا۔کیونکہ اس وقت میری یہ حالت تھی کہ میں بالکل دیوانہ سا ہو رہا تھا۔مجھے یوں لگتا تھا کہ میری روح ابھی میرا جسم چھوڑ جائے گی۔ میرا دماغ ابھی پھٹ جائے گا۔مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں غبارہ ہوں، جس میں ہوا بھری جا رہی ہے اور اتنی زیادہ بھری جا رہی ہے کہ بس اب غبارہ پھٹ پڑے گا۔اس لمحے زیما کا تسلی دینا میرے لئے احسان کا درجہ رکھتا تھا۔میں نے صدق دل سے اس کے لئے دعا مانگی۔

شیخ احمد مجھ سے بہت خوش تھے۔مجھے دیکھتے ہی ان کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھتا تھا۔میں سوچتا جس طرح سعادت مند اولاد ماں باپ کی عزت وتوقیر کا باعث بنتی ہے ہونہار شاگرد بھی استاد کے لئے باعث فخر ہے۔میرا جی چاہتا میں ایسا بن جاؤں کہ میری ذات سے سارے خوش رہیں۔یہ بھی اس ذات کریمہ کا بہت بڑا کرم ہے کہ اس نے میری ذات سے میرے گھر والوں کو ہر طرح سے اطمینان بخشا تھا۔اکثر وبیشتر شیخ احمد کی اجازت سے روحانی محفلوں میں میرے لیکچر ہوتے۔ممی پاپا ان میں ضرور شرکت کرتے۔میری باتیں سن کر ان کی آنکھوں میں چمک آ جاتی اور وہ سب خوشی خوشی خود ہی تعارف کراتے یہ ہمارا بیٹا ہے۔کبھی خوشی میں آ کر ممی وہیں سب کے سامنے میری پیشانی چوم لیتیں۔مجھے دادی اماں یاد آ جاتیں۔میں ایک گہرا سانس اندر لیتا اور دادی اماں کی خوشبو میرے باطن میں پھیل جاتی۔ میں سوچتا روح کی خوشبو سب سے پہلے دادی اماں نے ہی مجھے سنگھائی ہے۔میں اس خوشبو کو کیسے بھول جاؤں۔وہی تو میرے گلستان ارم کی باد بہاری ہے۔

آج میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ روحانی علوم صرف علم نہیں ہے بلکہ یہ روح کی صلاحیتیں اور صفات ہیں۔اللہ تعالیٰ نے آدم کے اندر اپنی صفات پھونک دیں جو آدم کی روح ہے۔یہی روح آدم کی قوت ہے۔آج اگر میں روح سے بیگانہ ہوتا تو باطن میں خوشبو کا احساس کیسے ہوتا۔لوگ تو صرف ناک سے سونگھی ہوئی خوشبو کو ہی پہچانتے ہیں۔وہ اس بات سے واقف نہیں کہ اصل خوشبو روح کی روشنی ہے۔ روح کی روشنی اسمائے الٰہیہ کی صفات ہیں۔اسمائے الٰہیہ کی ہر صفت ایک رنگ ہے اور ہر رنگ کا جمال خوشبو ہے۔یہی جمال اور خوشبو روح کی لطافت ہے۔

روحانی علوم حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ روح کی صلاحیتوں اور قوتوں کو استعمال میں لایا جا رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب خوشبو کا خیال آتا ہے تو احساس لطیف ہو جاتا ہے اور یہ لطافت سارے باطن میں محسوس کی جاتی ہے۔ایک مرتبہ شیخ احمد نے ایسے ہی موقع پر حواس کی تعریف بیان کی تھی۔ فرمانے لگے، روحانی کیفیات و واردات میں آدمی غیب میں دیکھتا بھی ہے اور غیب کی آوازیں بھی سنتا ہے۔اگرچہ یہ آوازیں دل و دماغ میں سنتا ہے اور اپنے اندر ہی دیکھتا ہے۔مگر اسے اس کا اس قدر یقین ہوتا ہے جیسے ظاہری حواس سے دیکھنے اور سننے کا یقین ہوتا ہے۔اس یقین کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ہمارے حواس ظاہر میں کام کر رہے ہیں اسی طرح باطنی رخ میں بھی کام کرتے ہیں۔جب ہم حواس کے باطنی رخ سے متعارف ہوتے ہیں تو پھر ہمیں اس کا احساس ہو جاتا ہے۔باطنی رخ غیب ہے اور غیب لامحدود ہے۔جس کی وجہ سے باطن سے متعلق ہر ادراک زمان و مکان سے آزاد اور وسیع دکھائی دیتا ہے اور جب تک ہمارے اوپر سے ٹائم اینڈ اسپیس کی گرفت نہیں ٹوٹے گی اس وقت تک غیب سامنے نہیں آ سکتا۔

ننھا نعمان اب ساڑھے تین سال کا ہو گیا تھا۔خوب پٹر پٹر باتیں کرتا۔میں نے نزیما سے کہہ دیا تھا کہ اس سے ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر اس طرح کرے جیسے اللہ میاں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ کیونکہ بچہ لاشعوری حواس سے شعوری حواس کی طرف آتا ہے۔بچے کے لئے غیب سے آگاہی مشکل نہیں ہے۔بشرطیکہ اس کی توجہ اس طرف دلائی جائے۔ایک رات نعمان سو نہیں رہا تھا اس کے سونے کا ٹائم بھی گزر گیا۔نزیما دن بھر گھر کے کاموں میں تھک گئی تھی۔اس نے دو تین دفعہ اسے سونے کو کہا مگر وہ کھیل میں لگا رہا۔رات کافی ہو گئی تھی میں نے نعمان کو اپنے پاس بلا لیا۔اسے اپنی گود میں بٹھایا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔نعمان بیٹے آپ کو پتہ ہے نا اللہ میاں ہر وقت ہم کو دیکھتے

رہتے ہیں۔ کہنے لگا ہاں پتہ ہے پاپا۔ مگر ابھی تو اللہ میاں یہاں نہیں ہیں نا۔ میں نے فوراً کہا۔ اللہ میاں یہاں موجود ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ بہت رات ہوگئی ہے اب سو جاؤ۔ اس نے جلدی سے ایک کونے کی جانب دیکھا تھوڑی دیر تک گھورتا رہا پھر میرے سینے میں منہ چھپا کر کہنے لگا پاپا اللہ میاں کی بات ماننی چاہئے نا۔ میں نے کہا۔ ہاں بیٹے اللہ میاں تو سب سے بڑے ہیں۔ کہنے لگا تو میں سو جاتا ہوں اور اسی وقت آرام سے سو گیا۔ اب ہم وقتاً فوقتاً اسے اللہ تعالیٰ کی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے۔ مثلاً جب وہ اسکول جانے کے لئے گھر میں سب کو سلام کرتا تو ہم اسے کہتے کہ اللہ میاں کو بھی سلام کرو۔ وہ ادب سے جھک کر سلام کرتا پھر چلا جاتا۔

غیب میں دیکھنے کے لئے یقین ہی تو نگاہ بنتا ہے اگر بچپن سے یقین کا پیٹرن بن جائے تو قلب کی نگاہ بھی کھل جاتی ہے۔ یہ تجربہ تو دادی اماں نے مجھے بچپن سے ہی کرایا تھا۔ وہ جب بھی غیب کی باتیں کرتیں اس طرح کرتیں جیسے سب کچھ سامنے موجود ہے اور اکثر میں ان سب چیزوں کو دیکھ لیا کرتا تھا کبھی اگر نظر نہ آتا تو دادی اماں پر اتنا یقین تھا کہ فوراً ہی مان لیتا کہ یہ سب درست ہے۔ میں اپنے بچے کی پرورش بھی انہیں خطوط پر کرنا چاہتا تھا۔ اس سے بچے کے اندر ادب بھی پیدا ہو رہا تھا۔ وہ گھر کے تمام افراد کے ساتھ نہایت ہی ادب سے بات کرتا اور بات بات پر اللہ میاں کا نام اس طرح لیتا جیسے اسے اس بات کا احساس ہے کہ اللہ میاں آس پاس موجود ہیں۔ ہم نے اسے کلمہ اور چند چھوٹے چھوٹے عربی کے الفاظ و اسم سکھائے ہم زیادہ زور اللہ پاک کی ذات پر یقین رکھنے کی جانب دیتے تا کہ وحدانیت کا شعور بچے کے اندر پہلے پختہ ہو جائے پھر آہستہ آہستہ اسے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات مبارک کے بارے میں بھی بتایا۔ ابھی تو ہم نے اس کے سامنے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اللہ میاں کے دوست کی حیثیت سے لیا تھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اللہ میاں کے دوست ہیں اور سب سے اچھے دوست ہیں۔

چار سال کی عمر میں نعمان اسکول جانے لگا۔ اسے اسکول جاتے ہوئے تقریباً سات آٹھ ماہ ہو گئے تھے اور اب وہ زیادہ اچھی طرح سمجھنے لگا تھا کیونکہ اسکول میں بھی کلمہ شریف وغیرہ پڑھایا جاتا تھا اور اسکول میں اس کے دوست بھی بن گئے تھے۔ اس طرح وہ دوست کا مفہوم جان گیا تھا۔ اب اکثر پوچھتا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست ہیں تو اللہ سے کس طرح ملتے ہیں۔ کیا اللہ میاں کے ساتھ آسمان پر سیر کو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ہم سب اسے بالکل صحیح صحیح حقیقت کی باتیں بتاتے کہ اللہ پاک

نور ہے۔یعنی روشنی ہے۔وہ روشنی کی دنیا میں اپنے دوست کو لے کر جاتے ہیں۔

میرا نظریہ یہ ہے کہ بچے کو ہمیشہ حقیقت ہی بتانی چاہئے کسی بھی بات کو توڑ مروڑ کر اس طرح پیش نہیں کرنا چاہئے کہ وہ صرف مفروضہ یا کہانی بن کر رہ جائے اور جب بچہ بڑا ہو اس میں فکشن اور حقیقت کو پرکھنے کی سمجھ آجائے تب اس کو یہ کہانی یاد آئے تو وہ یہی سوچے گا کہ بڑوں نے کیا فضول باتیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے میرے دماغ میں بھر دیں۔کیونکہ دماغ تو ایک کمپیوٹر ہے۔بچے کے کمپیوٹر میں بڑے ہی پروگرامنگ کرتے ہیں بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے تو اس کی اسکرین پر اپنے پروگرام کو دیکھ لیتا ہے۔تو کیوں نہ ہم بچے کے ذہن میں ایسی پروگرامنگ کریں جس سے بچہ بڑا ہو کر خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسرے بھی فائدہ اٹھائیں۔طلسماتی اور فکشن کہانیاں بڑے ہو کر جب بچے کو یاد آتی ہیں تو اس کے ذہن میں بے یقینی کا پیٹرن بنتا ہے۔وہ اس جھوٹی کہانی کو دہرا کر اسے بھولنے کی کوشش کرتا ہے یعنی اپنے دماغ کے کمپیوٹر سے بزرگوں کے فیڈ کئے ہوئے پروگرام کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔بچپن میں چونکہ ذہن صاف ہوتا ہے اس لئے نقش بھی گہرا ہوتا ہے۔اسے مٹانے کی کوشش میں بار بار یہ نقش آنکھوں کے سامنے آتا ہے اور آپ اسے دہرانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔کیوں نہ ایسی بات لوگوں میں دہرائی جائے جو حقیقت ہو۔جسے بچہ فخر سے ہر ایک کے سامنے بیان کرے کہ جب میں چھوٹا تھا تو میری دادی نے یوں کہا تھا، میری ماں نے یوں کہا تھا اور آج مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کتنا سچ کہا کرتی تھیں۔حقیقت تو یہی ہے کہ ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔اگر فطرت کے اصولوں پر بچے کی نشو و نما کریں اور اسے ہر شئے کے اندر کام کرنے والی فطرت سے متعارف کرائیں تو بچے کی صحیح طرز فکر بن جائے گی۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچہ ابھی چھوٹا ہے نہیں سمجھے گا۔یہ سوچ کر اسے غلط سا فرضی باتیں سنا کر چپ کر دیتے ہیں۔ہم حقیقت کو فرضی لباس کی بجائے سادے لباس میں بھی تو پیش کر سکتے ہیں۔خواہ بچہ اس وقت پوری طرح نہ سمجھے مگر عقل کے ساتھ ساتھ اس پر اس کے صحیح مفہوم تو کھلتے جائیں گے۔اگر ہم بچے سے یہ بات کہتے ہیں کہ دیکھو اللہ تمہارے سامنے ہے تو اللہ بھی تو یہی کہہ رہا ہے کہ میں تم سے تمہاری رگِ گلو سے بھی زیادہ قریب ہوں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے بچپن سے ہی بچے کو اللہ پاک کی حقیقت سے آگاہ کر دیا۔اب کیسے ہو سکتا ہے کہ بچے کے ذہن میں یقین کا پیٹرن نہ بنے اور اس کے اندر مشاہداتی آنکھ نہ کھلے۔اپنے بچے کی ان خطوط پر پرورش کرتے وقت ہر لمحے میرا ذہن

دادی اماں کی جانب رہتا گویا میں دادی اماں کے فیڈ کردہ پروگرام پر عمل کر رہا ہوں۔

ان ہی دنوں ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ میرے ہاتھ میں اخبار ہے جس کے سرورق پر دادی اماں کی بہت بڑی سی رنگین تصویر ہے۔تصویر میں وہ جوان اور بہت خوبصورت لگ رہی ہیں۔ان کے سر پر ٹوپی ہے۔اس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا سا کالم ان کی خبر سے متعلق لکھا تھا۔پورے سرورق پر بس یہی ایک خبر ہے۔میں بے حد خوشی خوشی اخبار لے کر دوڑتا ہوا گھر کے اندر آتا ہوں اور زور زور سے گھر کے ہر ہر فرد کو بتاتا ہوں کہ دیکھو! یہ کتنی بڑی خبر دادی اماں کی چھپی ہے۔یہ خبر ہے ہی اتنی اہم جبھی تو سرورق پر دادی اماں کی تصویر کے ساتھ چھپی ہے۔اگر انہوں نے یہ خبر سرورق پر نہ چھاپی ہوتی تو مجھے ان سے سخت شکایت ہوتی۔میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔اسی وقت آنکھ کھل گئی۔فوراً ہی دماغ میں آواز آئی ''اللہ کے سلام کے ساتھ اور حدود کامل کے ساتھ تمہاری دادی اماں کو ولیوں کے درجے میں رکھا گیا ہے۔'' یہ بات تین مرتبہ دہرائی گئی۔صبح اٹھ کر میں نے یہ خواب گھر کے تمام افراد کو سنایا۔ پاپا تو سن کر رونے لگے امی نے اسی وقت کچھ کھانا وغیرہ پکایا اور یتیم خانے میں بھجوا دیا۔میں نے نفل نماز پڑھ کر ان کے لئے دعا کی کہ اللہ پاک ان کے درجات کو اور زیادہ بلند فرمائے۔

ایک مرتبہ محفل مراقبہ کے بعد شیخ احمد نے سلسلے کے تمام افراد کو اکٹھا کیا اور فرمایا کہ آج سے آپ لوگ روزانہ اپنے ہاتھ سے پانچ روپے کسی غریب کو خیرات دیا کریں گے۔اس وقت تو کوئی کچھ نہ بولا مگر ان کے اٹھنے کے بعد کچھ لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ اتنی مہنگائی میں سب لوگوں کا پانچ روپیہ روز خیرات دینا کیسے ممکن ہے وغیرہ وغیرہ۔میں نے کہا یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ہمارے لئے تو صرف حکم کی اہمیت ہونی چاہئے خواہ کسی طرح بھی تعمیل کرنی پڑے۔حکم کی تعمیل میں چون و چرا کہاں ہے بہرحال کئی لوگوں کے اوپر اس حکم سے ناگواری اور بے یقینی کے تاثرات قائم ہو گئے۔تقریباً تین چار ہفتے گزر گئے۔

ایک دن جب سب لوگ جمع تھے۔شیخ احمد نے پوچھا میں نے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ روزانہ اپنے ہاتھ سے پانچ روپے خیرات کرنا ہے۔مجھے بتائیں کہ کون کون اس پر عمل کر رہا ہے۔سات لوگ ایسے تھے جو دو تین بار دے کر چپ بیٹھ گئے تھے حالانکہ ان سے زیادہ غریب لوگ مستقل دے رہے تھے۔شیخ احمد نے وجہ دریافت کی تو مالی پریشانی کا ذکر کیا۔اب شیخ احمد نے غریب سے دریافت کیا۔وہ کہنے لگا میرے لئے تو صرف آپ کے حکم کی اہمیت ہے۔میں نے بہرحال اس پر عمل کیا تو میرے وسائل

میں وسعت آگئی اور خود بخود آمدنی میں اضافہ ہوگیا۔ایسی جگہوں سے وسائل پیدا ہوئے جہاں میرا خیال بھی نہ جا سکتا تھا۔اب تو میں ایسا ہی کروں گا اور اس عمل کو مستقل کرنے کا ارادہ ہے۔شیخ احمد نے دوسروں سے فرمایا۔تمہارے حالات تو ان سے بہتر تھے اگر تم کچھ عرصے تعمیل حکم میں لگے رہتے اور اپنے دل میں شکوک وشبہات نہ لاتے تو کیا اللہ پاک تمہارے وسائل بھی وسیع نہ کردیتا۔

شیخ احمد کو اس بات سے سخت غصہ تھا کہ بعض لوگ مرشد تو کہتے ہیں مگر اطاعت نہیں کرتے۔ صرف زبان سے کہہ دینا کیا حکم پر عمل کرنے کے برابر ہے۔یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔میں نے ایک بات کہی آپ نے نہیں مانی۔اس کا کیا مطلب ہوا۔شیخ احمد نے فرمایا۔اگر مرشد کے حکم پر مرید کے ذہن میں نتائج کا خیال آگیا تو یہ خیال نافرمانی کے دائرے میں شمار ہوگا۔

اس واقعہ سے میں یہ غور کرنے لگا کہ روحانیت کے راستے پر اچھے بھلے چلتے چلتے لوگوں کے ذہن میں شک کیوں آجاتا ہے۔غور کرنے پر یہ بات سمجھ میں آئی کہ لوگوں کی طرز فکر بدلنا بے حد مشکل کام ہے۔بچپن کے نقوش طرز فکر بناتے ہیں۔بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کا شعور ایک نقطہ سے شروع ہوتا ہے۔اب یہ نقطہ آہستہ آہستہ نشو ونما پاتا ہے تقریباً بارہ برس کی عمر تک شعور اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ بچہ اپنے ذہن سے کام لیتا ہے۔بچپن سے بارہ برس کی عمر تک بچے کا ذہن ایک کورا کاغذ ہوتا ہے۔کورے کاغذ پر جو نقش بنتا ہے وہ ذہن کا اولین نقش ہے۔ذہن کے اولین نقوش آدمی کی طرز فکر بن جاتے ہیں۔یہ نقوش فکر وخیال Base بن جاتی ہے جس پر ذہن کے تمام خیال اپنی عمارت بناتے ہیں۔ذہن کے ان نقوش کو مٹانے سے مراد یہ ہے کہ تفکر کی بنیاد بدل دینا اور بنیاد بھی اس طرح بدلنا کہ ان پر بنائی ہوئی عمارت تباہ وبرباد ہونے کی بجائے ان کی دیواروں اور چھتوں و دروازوں پر نیا روغن کردیا جائے تاکہ عمارت بدلی ہوئی لگے تاکہ نئے اور پرانے نظریات کا فرق معلوم ہو جائے کیونکہ بڑے ہوکر شعور کے نقوش مدھم ہو جاتے ہیں مگر مٹتے نہیں ہیں۔ان مدھم نقوش پر نئے نقوش جب تک گہرے نہ ہوں ذہن کی نظر دونوں نقوش پر پڑتی رہتی ہے اور یہی شک وسوسے کی بنیاد ہے۔مرشد اپنی وقت تصرف سے مرید کے ذہن کے باطل نظریات مٹاتا جاتا ہے اور ہر باطل نقش کے اوپر صحیح نقش بناتا جاتا ہے مگر مرید اپنے شک کی وجہ سے ان تمام کوششوں کو رائیگاں بنا دیتا ہے۔شک اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ مرید شیخ کے کاموں میں اپنے ذہن سے سوچتا ہے۔میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ مرشد کے سامنے مرید کو اس طرح ہونا چاہئے جیسے غسال کے ہاتھوں میں مردہ۔

شیخ احمد نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ہمارے دماغ میں خیال کی دو رو چلتی ہیں۔ایک رو میں خیالات کا عکس واضح روشن اور صاف ہوتا ہے۔ یہ پازیٹیو خیال ہے۔ دوسری رو میں خیال کا عکس غیر واضح مدھم اور تاریک ہوتا ہے۔ یہ نیگیٹیو خیال ہے۔ پازیٹیو رو دماغ کی کلاک وائز گردش دیتی ہے۔ نیگیٹیو رو دماغ کو اینٹی کلاک وائز گردش میں متحرک کر دیتی ہے۔ دماغ جس رخ میں گردش میں گردش کرتا ہے ذہن کی اسکرین پر اسی رخ کے مناظر و تصاویر آتی جاتی ہیں۔ جب آدمی ایک ہی رخ میں بہت عرصے تک سوچتا رہتا ہے تو ذہن کی یہ گردش پکی ہو جاتی ہے اور یہی پکا طرز فکر کہلاتا ہے۔ میں سوچنے لگا جو لوگ مرشد کے حکم میں اپنا ذہن مخالف طور پر چلاتے ہیں وہ مرشد سے محبت کا دعویٰ کس طرح کر سکتے ہیں۔محبت تو خود سپردگی کا نام ہے۔قبض اور بسط کی کیفیات بھی ذہن کی انہی دونوں گردشوں سے پیدا ہوتی ہیں۔نیگیٹیو خیالات ہر اچھے خیال کو ذہن میں آنے سے روکتے ہیں۔اچھا خیال روشنی ہے اور روشنی انرجی ہے۔انرجی سے محروم دماغ اپنے آپ کو ہر طرف سے جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔یہی صورتحال قبض کی کیفیات ہیں۔اس کے برخلاف پازیٹیو خیال دماغ کی انرجی ہے۔انرجی ملنے پر فکر کی روشنی دور دور تک پھیل جاتی ہے اور ذہن و دل کی آنکھ اس روشنی میں صاف اور واضح تصاویر دیکھتی ہے۔یہی بسط کی حالت ہے جو آزاد فکر ہے۔میرا ذہن اب تمام چیزوں کو خوب اچھی طرح سمجھنے لگا۔جیسے جیسے میری سمجھ اس راستے پر بڑھتی جاتی۔مرشد کے اپنے اندر تصرفات اور روحانی کاموں کا اندازہ ہوتا جاتا اور پہلے سے زیادہ ادب و احترام اور محبت کا احساس ہوتا۔میرا جی چاہتا میں مرشد کے کاموں میں ان کا معاون و مددگار بن جاؤں۔وہ مجھ سے آرام پائیں۔محبت و احساس کا یہی جذبہ دن بدن مجھے مرشد کی ذات سے قریب کرتا گیا۔مجھ یوں لگتا جیسے میرا دل مرشد کے خیال کی گزرگاہ ہے۔جو خیال مرشد کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے وہ خیال میرے دل کی راہ سے ہو کر گزرتا ہے۔مجھے اپنی سانسوں میں مرشد کی سانسوں کا احساس ہوتا، مجھے یوں لگتا جیسے یک جان دو قالب کی مانند میری اور مرشد دونوں کی روحیں ایک ہیں۔ اپنی ان کیفیات کا تذکرہ جب شیخ احمد سے کیا تو وہ فرمانے لگے۔حقیقت محمدی ﷺ کے دائرے میں ساری کائنات میں ایک ہی روح کام کر رہی ہے۔یہ روح تجلی ذات کا شعور ہے۔جو روح اعظم کہلاتی ہے۔جب مرید کے اندر روح اعظم کا شعور متحرک ہو جاتا ہے تو وہ مرشد کے اندر متحرک روح اعظم کے شعور سے مل جاتا ہے۔اس طرح ذات کی قربت کا احساس ہوتا ہے کیونکہ ذات تو باری تعالیٰ کی تجلی ہے اور یہ تجلی ہی کائنات کی Base ہے۔

مئی کا مہینہ تھا میں آفس میں تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ پاپا بول رہے تھے۔ کہنے لگے تم جتنی جلد ہو سکے گھر آ جاؤ۔ ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ راحیلہ کی خالہ کا زبردست ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ملتان روڈ پر یہ لوگ جا رہے تھے۔ گاڑی ان کی نند چلا رہی تھیں۔ نند کے بچے اور راحیلہ کی خالہ کے بچے سب گاڑی میں تھے۔ نند کی دس سالہ بچی کا موقع پر ہی انتقال ہو گیا ہے۔ یہ ایکسیڈنٹ دو گھنٹے پہلے ہوا تھا۔ فوری طبی امداد کے بعد اب انہیں کراچی لایا جا رہا ہے۔ خبر سن کر میں سخت پریشان ہو گیا۔ چچی کا خاص خیال آ رہا تھا کیونکہ دونوں بہنوں میں بہت محبت تھی۔ فرزانہ خالہ تھیں بھی بہت اچھی اور ابھی تو وہ بالکل نوجوان تھیں۔ چھوٹے چھوٹے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا ڈیڑھ سال کا تھا۔ لڑکی ساڑھے چار سال کی تھی۔

اس وقت ساڑھے تین بجے تھے۔ میں نے منیجر کو فون کیا کہ فوری طور پر میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فوراً مجھے کمرے میں بلا لیا۔ انہیں صورتحال سے آگاہ کر کے ان سے اجازت لی اور گھر آیا تو سارے فرزانہ خالہ کے منتظر تھے۔ یہ تو پتہ تھا کہ بہت سیریس ایکسیڈنٹ ہوا ہے مگر اور زیادہ کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ایمبولینس آ کر رکی۔ انہیں ہوائی جہاز سے لایا گیا تھا فوراً ہی دونوں بچوں کو گھر اتارا گیا اور ایمبولینس نہایت تیزی سے اسپتال کی جانب روانہ ہوئی۔ ایمبولینس میں ان کے ساتھ ان کے شوہر بھی تھے۔ ہم سب اپنی اپنی گاڑیوں میں ان کے پیچھے روانہ ہوئے۔ ممی، راحیلہ اور ثمینہ گھر پر دونوں بچوں کے ساتھ رک گئیں۔ زیبا بھی گھر پر تھی۔ فرزانہ خالہ کے دونوں بچوں کو معمولی خراشیں تھیں۔ ٹھیک ٹھاک تھے۔ مگر خود وہ بہت زیادہ زخمی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے ڈاکٹروں کے مشورے سے انہیں کراچی لایا گیا تھا۔

ہسپتال جاتے ہی ان کا ایمرجنسی آپریشن ہوا۔ انہیں اسپیشل یونٹ میں رکھا گیا۔ ان کی پانچ پسلیوں میں کریک آ گیا تھا۔ لیور کا ایک حصہ کٹ گیا تھا اور بھی کئی چیزیں متاثر تھیں۔ بہت سیریس حالت تھی۔ ہمارے لئے سوائے دعا کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ ان کے شوہر نے بتایا کہ ان کی بہن گاڑی چلا رہی تھیں۔ یہ سب مل کر اپنی دوست کی شادی میں جا رہے تھے۔ وہاں پر تین دن ٹھہرنے کا پروگرام تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فرزانہ خالہ کے شوہر نہ گئے۔ ملتان روڈ پر گاڑی تیز رفتار تھی کہ سامنے سے دوسری بڑی وین آ گئی۔ اس کو بچانے کے لئے سڑک کے کنارے والی سائیڈ پر تیزی سے موڑی تو سڑک کا کنارہ بہت نیچا تھا۔ گاڑی دو قلابازیاں لگا کر رک گئی۔ اس قلابازی کی وجہ سے نند کی بیٹی کا سر دو تین بار بری طرح چھت سے ٹکرایا اور فرزانہ خالہ سخت زخمی ہو گئیں۔ خالہ کے دونوں بچے دروازہ خود بخود کھلنے کی وجہ سے

باہر گر پڑے۔نند ٹھیک تھیں۔انہوں نے اتر کر لوگوں کی مدد سے سب کو ہسپتال پہنچایا۔مگر اس کی اپنی بیٹی راستے میں ہی فوت ہوگئی۔دو دن تک انہیں اسپیشل یونٹ میں رکھنے کے بعد کمرے میں لے آئے۔ان کی حالت ابھی بھی کافی تشویشناک تھی۔سب نے ان کے کمرے میں رہنے کے لئے ڈیوٹیاں بانٹی تھیں تا کہ کسی ایک کے ذہن پر زیادہ دباؤ نہ پڑے۔زیادہ تر ان کے پاس چچی اور فرزانہ خالہ کے شوہر رہتے۔ہم لوگ اپنے اپنے وقت میں ایک دو گھنٹے رک کر آ جاتے۔دس دن تک وہ ہسپتال میں رہیں۔پسلیوں کے کریک ہونے کی وجہ سے وہ ہل بھی نہیں سکتی تھیں اور لیور کٹنے کی وجہ سے ان کے آگے پیچھے سے کافی بڑے بڑے آپریشن ہوئے تھے۔

دس دن کمرے میں رکھنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا اب آپ انہیں گھر لے جائیں۔اب انہیں صرف آرام کی ضرورت ہے چونکہ خالہ ملتان میں رہتی تھیں۔ہم انہیں اپنے گھر لے آئے۔ان کے لئے ایک کمرہ پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔شام کو اڑوس پڑوس کی کچھ عورتیں بھی انہیں دیکھنے آ گئیں۔بیٹھ تو وہ سکتی نہیں تھیں۔لیٹے لیٹے تھوڑی باتیں کرتی رہیں۔رات کو ان کے کمرے میں چچی سوئیں۔

رات کے تقریباً چار بجے تھے کہ راحیلہ نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا میں فوراً اٹھا تو اس نے گھبرا کر کہا کہ خالہ کے شدید تکلیف ہے انہیں ڈاکٹر کی بتائی ہوئی ساری دوائیاں دے چکے ہیں جبکہ ڈبل ڈوز دے دیا ہے۔آدھے گھنٹے سے وہ تکلیف میں ہیں۔آرام نہیں آ رہا۔پھر اب چچی نے سب کو جگایا۔میں کمرے میں آیا تو وہ بری طرح کراہ رہی تھیں۔میں نے فوراً سب سے کہا کہ آپ سب کمرے سے باہر چلے جائیں اور دروازہ بند کر دیں۔سب فوراً چلے گئے۔اب میں نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور گہری آواز میں آہستہ آہستہ کہا خالہ اپنی توجہ صرف میری طرف رکھیں۔صرف چند منٹ میں آپ کا درد ختم ہو جائے گا میری آنکھوں میں دیکھیں آپ عرش کے نیچے ہیں۔میرے ہاتھ کے ذریعے سے عرش کا نور آپ کی پیشانی میں داخل ہو رہا ہے۔یہ نور آپ کے دماغ میں ذخیرہ ہو رہا ہے۔اب یہ نور آپ کے دل اور سینے میں پھیل گیا ہے۔آپ کا درد بالکل ختم ہو گیا ہے آپ کو نیند آ گئی ہے۔آپ گہری نیند سو رہی ہیں۔اس سارے عمل میں صرف چار منٹ لگے خالہ گہری نیند سو چکی تھیں۔ان کی گہری گہری سانسوں کی آوازیں آنے لگیں۔میں نے ایک دو منٹ تک اپنا ہاتھ رکھا اور انہیں کہا کہ اب آپ چار گھنٹے تک سوتی رہیں گی۔پھر آہستہ سے ان کے بیڈ سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔سارا گھر سہا ہوا تھا، سب نے ایک نظر کمرے میں جھانکا۔میں نے اشارے سے سب کو کہا کہ کمرہ بند کر دیں اور پھر ہم دوسرے کمرے میں جو

بالکل سامنے ہی تھا وہاں گئے۔ یہ ڈرائنگ روم تھا میز کے اطراف سارے بیٹھ گئے۔تقریباً سب ہی رو رہے تھے۔ میں نے سب کو تسلی دی کہ بیڈ تبدیل ہونے کی وجہ سے اور لوگوں کی ملاقات کی وجہ سے ان کے آرام میں خلل پڑا تھا۔اب وزیٹر بالکل بند کردیں اب یہ سوتی رہیں گی۔چند دن تک ہم انہیں سلا کر رکھیں گے تو ان کے زخم جلد بھر جائیں گے۔

چچی بار بار میرا ہاتھ پکڑ کر رو رو کر کہہ رہی تھیں۔''سلمان اس وقت تم نہ ہوتے تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔اتنی رات میں ڈاکٹر بھی جلدی نہ آتا۔''میں نے چچی کو تسلی دی اور کہا کہ''آج میں آفس سے چھٹی کرلیتا ہوں آپ ذرا نہ گھبرائیں۔بس صرف انہیں آرام کی ضرورت ہے گھر میں بالکل خاموشی رکھیں۔زیادہ لوگوں کو ان کے کمرے میں نہ جانے دیں۔اب میں خود آج ان کی پوری طرح دیکھ بھال کروں گا۔''وہ خوش ہوگئیں۔ہم سب ڈرائنگ روم میں ہی کرسیوں پر بیٹھے رہے۔زیبا اور ثمینہ نے ناشتہ لگایا۔

خالہ کے کمرے کا دروازہ بالکل سامنے تھا۔دروازہ بند تھا انہیں سوئے ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ابھی میں پلیٹ سے نوالہ اٹھا کر منہ تک لایا ہی تھا کہ مجھے دکھائی دیا خالہ جاگ گئی ہیں۔بس میں تیر کی طرح نوالہ پلیٹ میں رکھ کر دروازے کی جانب بھاگا۔سب لوگ وہیں بھونچکے بیٹھے تھے۔کمرے میں آیا تو خالہ نے آنکھیں کھولیں، کہا کہ مجھے ٹوائیلٹ جانا ہے۔میں نے اطمینان کا سانس لیا فوراً چچی کمرے میں آئیں اور انہیں بیڈ پین دیا۔میں نے باہر آکر زیبا سے کہا جلدی سے دودھ گرم کرکے ایک چمچ شہد ملا کر لاؤ۔پھر میں نے سب سے کہا کہ دراصل میں نے انہیں چار گھنٹے کی نیند کے لئے ہپنا ٹائز کیا تھا۔یہ دو (۲) گھنٹے بعد جاگ گئیں اس وجہ سے مجھے تشویش تھی مگر اس کی وجہ معلوم ہوگئی تو اطمینان ہوگیا ہے۔اب فوراً انہیں دودھ پلا کر اسی طرح سلا دیا۔اب کے سے وہ پورے چار گھنٹے گہری نیند سوتی رہیں۔پھر اٹھیں گرم دودھ شہد ملا کر پلایا۔پھر سلا دیا سارا دن میں اسی طرح کرتا رہا۔چار گھنٹے بعد اٹھا کر بیڈ پین دے کر دودھ پلا کر سلا دیتے۔وہ دن اور رات آرام سے گزر گئی بلکہ رات کو ساری رات ہی تقریباً سوئیں۔صبح چھ بجے اٹھیں تو کافی فریش تھیں۔کہنے لگیں۔اب درد بھی معمولی ہے، پھر وہ جاگتی رہیں۔

مجھے آفس جانا تھا، ساڑھے آٹھ بجے میں نے سوچا جبھی انہیں سلا کر چلا جاؤں گا۔چچی تو اب بھی گھبرا رہی تھیں۔بولیں سلمان بیٹے آج بھی آفس نہ جاؤ مگر مجھے کافی کام تھا۔میں نے انہیں تسلی دی

کہ میں دس منٹ میں تو گھر پہنچ جاتا ہوں ۔ویسے بھی اب انشاءاللہ یہ ٹھیک رہیں گی بس انہیں سونے دیں ۔ان سے باتیں کریں نہ انہیں بلائیں جلائیں ۔ میں شام کوجلدی گھر آجاؤں گا۔ میں تین بجے گھر آیا تو وہ جاگ رہیں تھیں، تکلیف تو تھی مگر ویسی شدت نہ تھی ۔انہیں جاگے ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے ۔ انہیں شہد اور دودھ پلا دیا گیا ۔اب پھر میں نے انہیں اسی طرح سلا دیا ۔ دو دن تک ہم انہیں ڈاکٹر کی گولی دیتے رہے اور میں ان پر اپنا تصرف کر رہا تھا ۔پھر تیسرے دن میں نے انہیں عملِ تنویم سکھا دیا کہ اس طرح خود ہی سو جایا کریں اور میں اپنے کام پر لگ گیا ۔

چوتھے دن سے انہوں نے ڈاکٹر کی گولیاں بھی بند کر دیں کہ یہ تو صرف درد کم کرنے والی ہیں میں تو ویسے ہی سو جاتی ہوں ۔اب کیا ضرورت ہے ۔اس طرح ایک ہفتہ بعد وہ اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گئیں اور نویں دن سے چچی کی مدد سے ٹوائلٹ میں بھی جانا شروع کر دیا اور اب آہستہ آہستہ کھچڑی، سوپ وغیرہ زود ہضم غذا دینے لگے ۔دس دن بعد ڈاکٹر نے ہسپتال بلایا تھا وہ خود ہی آرام سے گاڑی میں بیٹھ گئیں ۔ ڈاکٹر ان کی تسلی بخش حالت دیکھ کر بہت حیران ہوا ۔کونسی دوا لے رہی ہیں ۔ کیا کر رہی ہیں ۔ یہی پوچھتا رہا ۔ہم نے اسے نہیں بتایا کہ چار دن بعد سے دوا لینی بند کر دی ہے ۔ میں نے منع کر دیا تھا کہ خواہ مخواہ ڈرا دے گا کہ بغیر دوا کے یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا ۔خواہ مخواہ ذہن میں شک پڑ جائے گا ۔ہمیں تندرستی سے مطلب ہے چاہے جس طریق پر ہو ۔

پندرہ دن بعد محلے میں ایک شادی ہوئی ۔ خالہ کہنے لگیں میں گھر میں سخت بور ہو گئی ہوں، میں بھی جاؤں گی ۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں ۔ ساڑھی باندھ کر میک اپ وغیرہ کر کے خوب اچھی تیار ہوئیں ۔شام کو گھر آیا ۔خالہ کو دیکھ کر ایسی خوشی ہوئی شکل وصورت تو ویسے ہی ان کی بہت اچھی تھی ۔اب تو لگتا ہی نہ تھا کہ وہ کبھی بیمار بھی رہی ہیں ۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب شیخ احمد مری گئے ہوئے تھے ۔ کالہ کے ایکسیڈنٹ پر دوسرے دن انہیں میں نے فون پر دعا کے لئے کہہ دیا تھا ۔ مجھے تسلی تھی کہ حضور کی توجہ سے وہ ضرور صحت یاب ہو جائیں گی ۔خالہ ایک ماہ ہمارے یہاں رہیں ۔ان کے جانے سے پہلے شیخ احمد بھی کراچی آ گئے ۔گھر آئے تو میرے کہنے سے پہلے چچی نے انہیں ساری داستان سنا ڈالی ۔ میں نے کہا، حضور میرے آئینے میں آپ ہی کی تصویر ہے ۔

اس واقعہ سے خاندان کے افراد کے علاوہ محلے پڑوس میں بھی روحانی صلاحیتوں کا چرچا ہونے لگا اور بہت سے لوگوں نے ان علوم کو جاننے کی خواہش ظاہر کی اسی دوران ایک محفل میں شیخ احمد نے

مجھے پھولوں کے ہار پہنا کر اور خوشبو لگا کر سب کے سامنے با قاعدہ طور پر میرے خلافت و نیابت کا اعلان کیا۔

اسی رات میں نے دادی اماں کو خواب میں دیکھا وہ ایک بہت بڑی تقریب میں شامل ہیں اور بادشاہوں اور لارڈ کی طرح بہت ہی عظیم الشان دستر خوان لگا ہے۔میزیں انواع واقسام کے کھانوں سے پُر ہیں۔دادی اماں کا چہرہ گلنار ہو رہا ہے۔وہ ہنس ہنس کر سب لوگوں سے باتیں کر رہی ہیں۔میں وہاں جاتا ہوں مجھے دیکھتے ہی دادی اماں خوشی سے چلا پڑیں۔ارے سلمان بیٹے آؤ! آج ہم تمہاری خوشی میں دعوت کھا رہے ہیں۔سب لوگوں نے شیشے کے بلوریں گلاس شربت سے بھرے اور ایک دوسرے کے گلاسوں سے ٹکرا ٹکرا کر مجھے وش (Wish) کیا۔دادی اماں نے اپنے ہاتھ سے مٹھائی میرے منہ میں ڈالی۔ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا خواب سے جاگا تو خیال آیا کہ دادی اماں بچپن کی طرح آج بھی میرے شب و روز سے اسی طرح کنسرن (Concern) ہیں جس طرح پہلے تھیں۔اس وقت مجھے تین چار سال پہلے کی واردات یاد آ گئی جس میں میں نے یہ تمام سین دیکھ لئے تھے اور یہ دیکھا تھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں شیخ احمد نے مجھے پیش کیا اور آپ نے مجھے خلافت سے نوازا۔میں نے سوچا واردات میں کشف و الہام میں جو کچھ نظر دیکھتی ہے وہ غیب کی خبریں ہیں جس میں زمان و مکان کی روشنی کا عالم ہے۔اس روشنی کے عالم سے واقعات مادی عالم تک پہنچتے ہیں تب شعور ان سے واقف ہوتا ہے۔روشنی کے عالم میں اور مادی عالم کے ٹائم میں فرق ہے۔عالم روشنی میں وقت کی رفتار تیز ہے اور مادی عالم میں بہت آہستہ۔یہی وجہ ہے کہ روحانیت کے راستے پر آدمی اللہ کے امر کی حرکت کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔اس کے علم سے واقف ہو جاتا ہے۔مگر یہ علم اس کے احساس و شعور میں داخل ہوتے ہوتے عرصہ لگ جاتا ہے۔جیسے اللہ پاک نے فرمایا ہم نے ایک مبارک رات میں قرآن کو نازل فرمایا۔یہ برکت والی رات لاشعور کا وہ لمحہ ہے جب شعور کو اس بات کی اطلاع ملی اور شعور نے جان لیا کہ قرآن نازل کیا گیا ہے۔قرآن کی تعلیمات کیا ہیں ان کے مفصل علوم شعور پر کھلتے کھلتے تیس برس لگ گئے جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا وحی کا زمانہ ہے۔

ایک دن نزیما نے خوشخبری سنائی راحیلہ امید سے ہے۔ابھی تو شروع ہے اللہ خیریت سے نیک وتندرست اولاد دے۔دو تین ہفتے بعد ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں چارپائی پر لیٹا ہوا ہوں۔اتنے میں خیال آتا ہے کہ راحیلہ کا بچہ کہاں ہے۔میں اسے ڈھونڈنے کے لئے اٹھ کر بیٹھ جاتا

ہوں ۔ پہلے چارپائی پر دیکھتا ہوں نہیں ہوتا، پھر اٹھ کر کمرے کا ہر کونہ دیکھتا ہوں وہ نہیں ملتا۔ اب میں پریشان ہو جاتا ہوں اور اسے آوازیں دینے لگتا ہوں ۔شہزادے تم کہاں ہو۔تھوڑی دیر آوازیں دینے اور ادھر ادھر ڈھونڈنے کے بعد بچے کی باریک سی آواز آتی ہے ۔جیسے کہیں دور سے آرہی ہے وہ کہتا ہے میرا نام شہزادہ ہے۔ میں پلنگ کے نیچے چھپا ہوں مجھے پلنگ کے نیچے ڈھونڈیں ۔ میں گھبرا جاتا ہوں کہ ذرا سا بچہ پلنگ کے نیچے کیسے گر گیا چوٹ نہ آئی ہو۔ میں گھبرا کے چارپائی کے نیچے دیکھتا ہوں تو وہ ایک طرف کو پڑا ہوا ہے میں اسے وہاں سے نکالتا ہوں اس وقت آنکھ کھلی تو الہامی کیفیت طاری ہو گئی ۔جس میں بتایا گیا کہ راحیلہ کے کیس میں ماں یا بچے کی جان کو خطرہ ہے۔ بہت سی احتیاطیں بتائیں ۔ کچھ صدقہ کرنے کو کہا گیا ۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کر بڑا پریشان سا ہوا دعائیں مانگیں کہ اللہ پاک سب کچھ خیریت رکھے ۔زیما کو بتایا زیما نے چچی کو ساری بات بتائی چچی بھی ذرا فکر مند ہو گئیں ۔مشکل یہ تھی کہ راحیلہ کا میاں ان باتوں پر کچھ زیادہ یقین نہیں رکھتا تھا مگر راحیلہ کی ساس روحانیت پر یقین رکھتی تھی ۔ ویسے بھی جب جان کی بات آتی ہے تو آدمی احتیاط کرتا ہی ہے ۔اس نے صدقہ دے دیا میں یہی دعا کرتا کہ راحیلہ اور بچہ دونوں ٹھیک ٹھاک ہیں ۔

چھٹے مہینے پھر اسی قسم کے خطرے کا خواب دیکھا بڑی دعا کی کہ اگر جان کا خطرہ ہے تو راحیلہ کی زندگی بچا لینا ۔اس کو بعد میں اور بچہ ہو جائے گا ۔ ویسے بظاہر اس کی صحت بالکل ٹھیک ٹھاک تھی ۔ ویسے بھی اس کا میاں اچھا بڑا بزنس مین تھا ۔گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی ۔اب دوسری مرتبہ جب میں نے ایسا خواب دیکھا تو میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ خواہ مخواہ پریشان ہوں گے ۔بس زیما سے کہہ دیا کہ راحیلہ کی طرف دھیان رکھنا ۔اس سے اس کی صحت کے متعلق پتہ کرتی رہنا ۔راحیلہ کا نواں مہینہ شروع ہو گیا تھا ۔ چچی نے اسے کہا تھا کہ ڈلیوری ڈیٹ سے دن پندرہ دن پہلے گھر آجانا ویسے بھی وہ ہر ہفتے ملنے آتی تھی ۔ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی ۔جس کی وجہ سے سب مطمئن تھے ۔بکرے کا صدقہ دے کر اور بھی اطمینان ہو گیا تھا ۔

اتنے میں ایک رات کو چار بجے کے قریب فون آیا ۔اس کا میاں فون پر تھا راحیلہ کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی ۔ اسپتال لے گئے ہیں ۔اس وقت چچی اور امی دونوں کو ساتھ لے کر میں اسپتال پہنچا ہم باہر بیٹھے رہے ۔راحیلہ کو خاص کمرے میں لے جایا گیا تھا وہاں صرف اس کا شوہر اس کے پاس تھا ۔پھر تھوڑی دیر بعد وہ بھی باہر آ گیا ۔اس نے بتایا کہ راحیلہ کے پیٹ میں بچہ فوت ہو چکا ہے ۔اسے

ڈیلوری کے لئے لے گئے ہیں ۔کیس کافی خراب تھا۔آٹھ پونڈ وزن کالڑ کا بالکل ٹھیک ٹھاک لگتا تھا مگر نہ جانے کیسے فوت ہوگیا ۔راحیلہ کی طبیعت بہت خراب رہی مگر پھر اللہ پاک نے اس کی جان بچالی ۔دو (۲) دن تک بڑی پریشانی رہی ۔اسپتال سے ہم راحیلہ کو اپنے گھر لے آئے ۔بچے کا پیٹ میں فوت ہو جانا ایک معما ہوگیا ۔نہ ڈاکٹروں کو کچھ خرابی نظر آئی نہ راحیلہ کی کوئی بد احتیاطی یا کسی قسم کا کوئی حادثہ ایسا ہوا کہ جس سے بچے پر اثر پڑا ہو بالآخر سب ہی اس نتیجے پر پہنچے کہ قدرت کو یہی منظور تھا اور اس نے پہلے ہی اس بات کی اطلاع دے دی تھی ۔

اب میں نے گھر والوں سے دوسری مرتبہ کے خواب کا ذکر بھی کر دیا کہ آپ لوگوں کی پریشانی کی وجہ سے میں نے نہیں بتایا تھا۔ چچی کہنے لگیں ۔سلمان جب خواب میں ایک حادثے کا علم ہوگیا تو کیا یہ حادثہ روکا نہیں جا سکتا۔ میں نے کہا کہ خواب یا کشف میں جو بات دیکھی جاتی ہے وہ دراصل ٹائم کے اندر دیکھی جاتی ہے یعنی روشنی میں جیسے پروجیکٹر سے چلنے والی روشنی کے اندر فلم کی تمام تصاویر ہوتی ہیں ۔یہی روشنی جب اسکرین پر ٹھہرتی ہے تو تصاویر کو آنکھ دیکھ لیتی ہے ۔ٹائم یا روشنی کے اندر جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ ایک قدم نیچے اتر کر مظہر بن جاتا ہے ۔یعنی اسکرین پر ڈسپلے ہو جاتا ہے ۔یہ روکا نہیں جا سکتا ۔البتہ اس کی حرکت میں تبدیلی کی جا سکتی ہے ۔اس کی مثال یوں ہے کہ آپ اوپر دیکھتے ہیں کہ آپ کے سر کے اوپر ایک گیند آ رہی ہے ۔گیند کو تو آپ روک نہیں سکتے وہ ہر صورت میں آپ کے پاس آئے گی ہی البتہ آپ خود کو بچاؤ کے لئے اس کی زد سے دور ہو جائیں گے تاکہ چوٹ سے محفوظ رہیں ۔ اگر آپ نے گیند کو نہیں دیکھا تو وہ آپ پر آ گرے گی اور چوٹ لگ جائے گی ۔اس طرح حرکت کی لہروں میں تبدیلی آنے سے حفاظت ہو سکتی ہے ۔خواب یا کشف میں اطلاع کے ساتھ ساتھ حادثے سے محفوظ رہنے کا کوئی علاج بھی آدمی دیکھ لیتا ہے ۔اس علاج کا مطلب بھی حرکت کی لہروں میں تبدیلی ہے ۔جیسے راحیلہ کے لئے بکرے کی قربانی کا عمل تھا ۔ارادے کے ساتھ عمل کی یا حرکت کی لہریں رونما ہونے والے واقعے کی اسپیڈ میں تبدیلی کر دیتی ہیں وہ اس طرح کہ مادی حواس کی رفتار جتنی زیادہ سست ہوتی ہے اتنا ہی شعور پر دباؤ پڑتا ہے اور خیال کی روشنی مادی حواس کے دائروں میں آ کر رک جاتی ہے ۔حرکت کا رک جانا یا سست پڑ جانا خرابی ہے ۔جب ارادے کے ساتھ وہ خاص عمل کیا جاتا ہے تو اس کی حرکت کی لہریں حواس کے دائروں میں داخل ہو کر روشنی کے بہاؤ کو نارمل کر دیتی ہیں ۔

میں نے چچی سے کہا۔ چچی اللہ پاک کا شکر کیجئے کہ راحیلہ کی جان بچ گئی ۔وہ ٹھیک ٹھاک ہے یہ

صدقے کی برکت ہے۔اللہ پاک تو اس طرح عملی تجربوں سے اپنے بندوں کو اپنے علوم سکھاتا ہے۔ چچی کہنے لگیں سلمان تم تو واقعی بڑی عقلمندی کی باتیں کرتے ہو۔اللہ نے تمہیں حکمت بخشی ہے۔ایک کام تو تم کو کرنا ہی ہوگا۔ میں نے کہا کیا کام چچی۔ کہنے لگیں پچھلے ہفتے میری ایک بڑی اچھی دوست کی بیٹی کی بیماری کا مجھے پتہ چلا ہے میری سہیلی نے بتایا کہ اس کی بیٹی چھ ماہ سے بیمار ہے۔اس بیماری میں اس کا کالج بھی چھوٹ گیا ہے۔ڈاکٹروں کو اس کی بیماری کا پتہ نہیں چل رہا۔اصل میں اس کا گھر بہت دور ہے پہلے وہ قریب رہتی تھی تو میں ہر دوسرے ہفتے اس کے پاس چلی جاتی تھی۔ وہ بھی آجاتی تھی۔اب گزشتہ سال سے انہوں نے ملیر کالونی میں اپنا گھر بنالیا ہے۔جب سے بس میں ہی ایک بار اس کے گھر گئی ہوں وہ بھی نہیں آئی۔اب اس کی بیٹی کی بیماری کی خبر سن کر فکر ہو رہی ہے۔راحیلہ کی وجہ سے جا نہ سکی۔اب اس کو دیکھنے جاؤں گی کسی وقت۔میں نے کہا آپ اسے کل ہی دیکھ آئیں تا کہ صحیح صورتحال کا پتہ لگ جائے۔

دوسرے دن شام کو آفس سے گھر آیا تو چچی گھر پر نہیں تھیں۔رات کو آئیں کہنے لگیں سلمان اس کی بچی کی تو شکل ہی پہچانی نہیں جاتی۔اس قدر خوبصورت اور تندرست ہوا کرتی تھی۔ ماشاءاللہ انیس سال کی جوان لڑکی ہے۔بس ہڈیاں اور چمڑا رہ گیا ہے۔چہرے پر جھائیاں پڑ گئی ہیں۔ریڑھ کی ہڈی گول ہو کر کُھ نکل آیا ہے۔میری سہیلی تو بہت روتی تھی کہ چھ ماہ میں یہ حال ہو گیا ہے۔ایک سے ایک ڈاکٹر کو دکھا چکی ہوں۔ایکسرے کرا چکی ہوں۔ کچھ پتہ نہیں لگ رہا۔کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ سلمان تمہیں اس کو دیکھنا ہی ہوگا۔شاید تمہیں کچھ پتہ لگ جائے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے چچی کل رات کو چلے چلیں گے۔کھانا ذرا جلدی کھا کے نکل جائیں گے۔ پہلے میں دیکھ لوں۔اگر ضرورت پڑی تو شیخ احمد کو بھی دکھا لیں گے۔دوسرے دن شام کو دفتر سے آتے ہی ہم نے کھانا کھایا اور ملیر کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں جا کر دیکھا تو واقعی اس لڑکی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ چچی نے بالکل صحیح نقشہ کھینچا تھا۔ اس کی ماں بچی کی حالت دیکھ دیکھ کر خود زندہ درگور ہو رہی تھی۔میں نے اسے دم وغیرہ کیا اور کچھ روحانی علاج بتائے اور تسلی دے کر چلا آیا۔دل میں سوچنے لگا کل ضرور شیخ احمد سے اس لڑکی کا تذکرہ کروں گا۔ رات نیند آنے تک اس لڑکی کی تصویر آنکھوں میں پھرتی رہی۔دعا کرتا رہا اس کی ماں کا سوگوار چہرہ بھی بار بار سامنے آجاتا۔میں نے سوتے وقت بڑے صدق دل سے دعا مانگی۔رات کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ چچی کے ساتھ اس کے گھر گیا ہوں اور لڑکی کی ماں سے کہتا ہوں کہ مجھے خواب کے ذریعے اشارہ ہوا ہے کہ آپ اپنی بیٹی کے لئے یہ عمل کریں۔یہ عمل منگل اور ہفتے والے دن کرنا ہے۔

صبح اٹھ کر میں نے چچی سے کہا کہ میں نے خواب میں کچھ عمل دیکھا ہے۔ آج شام کو ان کے گھر جا کر بتا آئیں گے۔ ہم شام کو ان کے گھر گئے ان کی والدہ کو بتایا۔ دوسرے دن ہفتے کا دن تھا۔ وہ کہنے لگیں۔ سلمان اگر تم آ جاؤ تو اپنے سامنے کرا دو۔ مجھ سے کہیں غلطی نہ ہو جائے ہفتہ اتوار میری چھٹی بھی تھی۔ میں نے کہا خالہ میں آ جاؤں گا۔ آپ فکر نہیں کریں۔ میں گیارہ بجے ان کے گھر چچی کے ساتھ چلا گیا۔ وہ سارا عمل خواب کا پورا کر دیا۔ تیسرے دن ان کا فون آیا کہ دوسرے دن ڈاکٹر نے اسپتال میں خود ہی بلایا اور کہا کہ ان کی بیماری کا ہمیں پتہ چل گیا ہے۔ یہ دوا تین ماہ استعمال کرنے سے ٹھیک ہو جائیں گی۔ تیسرے دن سے دوا شروع کی گئی۔

پندرہ دن بعد ہم ان کے گھر گئے تو لڑکی کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ بہت تیزی سے رو بہ صحت تھی۔ وہ سب بہت دعائیں دینے لگے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ شیخ احمد سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ وہ فرمانے لگے۔ اللہ پاک نے ہر شے کو مقداروں میں بنایا ہے۔ ہر شے روشنی کی مخصوص اور معین مقداروں سے بنی ہے اور ہر شے کی حرکت بھی لہروں کی مخصوص مقداریں ہیں۔ شے کے اندر جاری و ساری حرکت کی لہروں میں تبدیلی کرنے کے لئے لہروں کی اس مخصوص فریکونسی کے اندر انسان کے ارادے کو متحرک کر دیتا ہے۔ پھر ارادے کے ساتھ آدمی اس کی حرکت میں تبدیلی کر دیتا ہے۔ وظائف اور تعویذ وغیرہ بھی اسی بنیاد پر اثر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آیت یا اسم روشنی و نور کی مخصوص فریکونسی ہے۔ تعویذ کے اندر موجود روشنیوں کی مقداریں مریض کے اندر داخل ہو کر مرض کی حرکت کی لہروں کو توڑ دیتی ہیں اور روشنیوں کے بہاؤ کو بحال کر دیتی ہیں۔ مرض حواس کے دائرے میں روشنیوں کے جمود سے پیدا ہوتا ہے۔

پے در پے دونوں واقعات دور بہت دور ماضی میں کھینچ کر لے گئے۔ ایک مرتبہ جب میں تقریباً چھ سال کا تھا۔ اسکول سے آیا تو چہرہ لال سرخ ہو رہا تھا۔ می نے دیکھا۔ میری پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ کہنے لگیں ارے بیٹا آپ کو تو سخت بخار ہے۔ میں ویسے ہی نڈھال ہو رہا تھا۔ جلدی سے مجھے لٹا دیا چادر اوڑھائی۔ اتنے میں دادی اماں کی آواز آئی۔ اے بہو کیا سلمان آ گیا۔ می بولیں۔ اماں سلمان کو تو بڑا تیز بخار ہو رہا ہے۔ یہ سنتے ہی دادی اماں کمرے سے باہر آ گئیں۔ کیا...... بخار ہو گیا۔ ارے صبح تو اچھا بھلا گیا تھا کیسے ہو گیا۔ میرے پاس آئیں۔ پیشانی پر ہاتھ رکھا منہ میں کچھ پڑھ کر پھونکا پھر بولیں میرے بچے کو نظر لگ گئی ہے۔ بہو جلدی سے جا کر پانچ عدد سرخ مرچیں لے آ۔ ابھی نظر اتار دیتی ہوں۔ ہاں

ایک چٹکی بھر نمک بھی لے آنا ۔کوئی کیا کرے میرا بچہ ہے ہی ایسا سندر۔نظر بھر کے دیکھ لیا ہو گا کسی نے ۔ دادی اماں برابر بولے چلی جا رہی تھیں ۔اتنے میں می مرچیں اور نمک لے آئیں ۔ دادی اماں اسے اپنے ہاتھ میں لے کر میرے سارے جسم پر پھیرنے لگیں اور کچھ پڑھتی بھی رہیں ۔اس کے بعد خود اٹھیں اور جا کر چولہے میں جلا دیا ۔اللہ کا کرنا تو دیکھئے ۔ایک گھنٹے میں بعد میں اٹھ کر کھیل کود میں مصروف ہو گیا ۔بخار کے ذرا بھی آثار نہیں تھے ۔ ماضی کا وہ لمحہ میرے حافظہ کا ایک نقش بن گیا ۔

اب میرا بالغ شعور حافظے کے اس نقش کو دیکھ کر اس کے اندر علمی توجیہہ تلاش کر رہا تھا ۔دل کہنے لگا ۔دادی اماں کی یقین کی نگاہ نے میری بیماری دیکھ لی اور اس کا علاج بھی کر دیا ۔انہیں یہ تو معلوم تھا کہ نظر لگ جاتی ہے مگر کیوں لگتی ہے اور آدمی پر اتنی جلدی اثر کیوں ہو جاتا ہے ۔اس سے وہ یقیناً واقف نہ ہوں گی ۔اب میرا ذہن حافظے کی اس تمثیل میں علم کی روشنیاں ڈھونڈنے لگا ۔خیال آیا کہ ہمارے اندر حرکت کی لہروں کا اور برقی قوت کا ایک نظام کام کر رہا ہے ۔اسی نظام کے کام کرنے سے حواس پیدا ہوتے ہیں ۔حواس دو سطح پر روشنیوں کو جذب کرتے ہیں اور ان دونوں سطح پر جذب شدہ روشنیوں کا اظہار کرتے ہیں ۔حواس کی ایک سطح مثبت کرنٹ یا روشنیوں کو جذب کرتی ہے ۔جبکہ دوسری سطح منفی کرنٹ کو جذب کرتی ہے ۔نظر لگنے کا مطلب یہ ہے کہ حواس کی منفی سطح پر کرنٹ نارمل سے زیادہ مقدار میں ذخیرہ ہو جاتی ہے ۔یہ مقداریں جس کی دوسرے شخص کی خیال کی روشنی کو جذب کر کے ذخیرہ ہو جاتی ہے ۔منفی کرنٹ کی مقداریں معمول سے زیادہ بڑھنے پر جسمانی نظام میں گڑبڑ ہو جاتی ہے ۔جس کا فوری اثر محسوس کیا جاتا ہے ۔نظر بد کا اتار منفی کرنٹ کو نیوٹرل کر دیتا ہے ۔اس علمی توجیہہ کے بعد، میں سوچنے لگا کہ ہمارا شعور ایک بیٹری کے سیل کی طرح ہے ۔اس سیل کا ایک حصہ مثبت اور دوسرا منفی ہے ۔ سیل کا درمیانی حصہ وہ ہے جہاں مثبت اور منفی کرنٹ آپس میں ملتے ہیں ۔یہی وہ مرکز ہے جہاں مثبت اور منفی دونوں رخوں کا بیک وقت مشاہدہ ہوتا ہے ۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہر کام میں میانہ روی اختیار کرنے کی ہدایت دی ہے تا کہ شعور میں آتے ہوئے خیال کو دونوں رخوں سے پرکھا جا سکے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دونوں رخ سامنے ہوں ۔یہی طرز فکر نیوٹرل کہلاتی ہے ۔نیوٹرل طرز فکر میں شعور ہر شئے کی علمی توجیہہ تلاش کرتا ہے ۔اس طرز فکر میں حواس کی حرکت بھی بیلنس میں رہتی ہے ۔کیونکہ ہر خیال جو شعور میں داخل ہوتا ہے ۔اس کی روشنیاں شعور کے مرکز پر جذب ہو کر شعور کی دونوں طرح کی روشنی کی قوت فراہم کرتی ہیں ۔اس طرح ذہنی روشنی کے اندر موجود دونوں قوتوں کو جان لیتا ہے اور

خیال کے اندر پازیٹیو اور نیگیٹیو دونوں مفہوم کو پہچان لیتا ہے۔ تب اس کے لئے فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ نیوٹرل طرزِ فکر رکھنے والا ہر عمل کے اندر حکمت کو پالیتا ہے۔ اس کے حواس میں اس کا شدید ردِ عمل نہیں ہوتا۔ حواس کا شدید ردِ عمل جسمانی نظام میں گڑ بڑ پیدا کر لیتا ہے۔ جیسے رنج و غم کا شدید ردِ عمل بے خوابی اور ہاضمے کے نظام کو خراب کر لیتا ہے۔ پس نیوٹرل طرزِ فکر میں دل، دماغ اور جسم سب کچھ پر سکون اور تندرست رہتے ہیں۔

شیخ احمد میری روحانی ترقی پر بہت خوش تھے اور روحانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ہمیشہ تلقین فرمایا کرتے تھے۔ جہاں کہیں بھی ان کا پروگرام ہوتا میری بھی شرکت ضروری سمجھی جاتی۔ ان کے خطاب سے پہلے مجھے تقریر کا موقع دیا جاتا۔ شیخ احمد فرماتے بندہ جتنی زیادہ اپنی صلاحیتوں کو ابھارتا ہے اتنی ہی اللہ تعالیٰ کی صفات بندے پر کھلتی رہتی ہیں۔ شیخ احمد نے فرمایا۔ بیٹا اللہ پاک کی شان جمالی کو زیادہ سے زیادہ جذب کرو تا کہ تمہارا آئینۂ دل اس کے نور سے جگمگا اٹھے۔

دونوں بچوں نعمان اور افشاں نے زیما کی مصروفیات بڑھا دیں۔ مگر اس کے ساتھ بچوں کی وجہ سے گھر میں ایسی رونق تھی جیسے پھولوں سے باغ کی رونق ہوتی ہے۔ بچے سارا وقت چڑیوں کی طرح چہکتے رہتے اور ان کے ساتھ ساتھ زیما بھی بلبل کی طرح ہنستی گاتی دکھائی دیتی۔ پہلے مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں زیما اپنے ابو کی موت کو سیریس نہ لے لے۔ مگر اس نے پنڈلی سے لوٹنے کے بعد کبھی بیقراری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بلکہ جب بھی پھپھا عتیق کا ذکر آتا۔ بڑے بربا دانداز میں ان کے گزرے ہوئے واقعات سناتی جس میں ان کی اچھائی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور اجاگر ہو جاتا۔ اس طرح بچوں کے سامنے وہ ان کے نانا کو بہترین نمونہ بنا کر پیش کرتی۔ ویسے بھی وہ ہر تیسرے چوتھے دن اپنے والد کو ضرور خواب میں دیکھتی۔ وہ اکثر کہتی۔ ابو مجھ سے جدا تھوڑی ہوئے ہیں۔ جب بھی مجھے یاد آتی ہے وہ کواب میں ملاقات کو آجاتے ہیں۔ اس ظاہر باطن میں ہم نے اتنا لمبا چوڑا فاصلہ ڈال رکھا تھا۔ اگر اس سے قطع نظر صرف مرکزِ تصور پر نظر رکھی جائے تو زمان و مکان کے فاصلے معدوم ہو جاتے ہیں۔ مجھے تو بس اپنے ابو سے پیار ہے۔ پیار تو روح کی ایک صفت ہے۔ اس میں ظاہر باطن، زمان مکان کا کیا تذکرہ۔ جب ابو دنیا میں تھے تب بھی میں ان سے پیار کرتی تھی اور اب دوسری دنیا میں تب بھی اسی طرح کرتی ہوں۔ غیب تو شعور کی آنکھ کے لئے ہے۔ روح کی آنکھ تو غیب کو ظاہر کی طرح دیکھتی ہے۔ ابو سے میرا پیار روح کی طرح وابستہ ہے۔ پھر اس میں دنیا اور غیب کا کیا تذکرہ۔ میں اس کی باتیں سن سن کر چونک

جاتا۔ کیونکہ وہ گھر کے کاموں میں بچوں میں ہنسنے بولنے میں مگن رہتی۔ جب سے افشاں ہوئی تھی تب سے مراقبہ کی محفل میں بھی اس کا جانا کم ہوگیا تھا۔ گھر میں بھی آنا جانا لگا ہوا تھا۔ بچوں سے جو وقت بچتا وہ مہمان داری میں خرچ ہو جاتا البتہ میں اس سے اکثر روحانی علوم کی باتیں کیا کرتا۔ لیکن اس کی باتوں میں ایسے نقطے ہوتے کہ سننے والے قائل ہو جاتے۔ خصوصاً اس کے ابو کی وفات کے بعد سے تو وہ بڑی وزن دار باتیں کیا کرتی تھی۔ میں سوچتا، زندگی کا ہر عملی تجربہ عقل وشعور کی دانائی کا ایک زینہ ہے۔ عقل اس زینہ سے چڑھ کر ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ میں ہر وقت اللہ پاک کا شکریہ ادا کرتا کہ اس نے مجھے ایک نیک بیوی اور میرے بچوں کو مثالی ماں عطا کی ہے۔ کیونکہ بلاشبہ بچوں کی تربیت میں ماں کا ہاتھ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگرچہ میری تربیت میں دادی اماں کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ بچپن میں اگر میری ماں مجھے دادی کے حوالے نہ کرتیں تو میں کبھی بھی ان کے قریب نہیں جاتا۔ می ہر وقت مجھے دادی اماں کے پاس رکھتیں۔ ان کا ادب کرنا سکھاتیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کاموں کا دھیان رکھنے کی تلقین کرتیں۔ ان کی میرے ساتھ بے پناہ محبت کا احساس دلاتیں۔ میرے دل میں دادی اماں کے لئے محبت پیدا کرنے میں میری می کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ اس لئے مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ بچوں کی تربیت میں ماں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ماں ہی بچے کے دل میں کسی کے لئے محبت پیدا کرسکتی ہے اور کسی کے لئے نفرت بھی پیدا کرسکتی ہے۔

بچوں سے پہلے ماں کی تعلیم و تربیت بہت ضروری ہے۔ جیسے استاد بننے کے لئے ٹیچر ٹریننگ ضروری ہے۔ ماں بننے سے پہلے ماں کو بچہ صحیح طور پر پالنے کی ٹریننگ لینی چاہئے۔ میرا ذہن ان سب باتوں پر غور کرتے ہوئے سوچتا فطرت سے بڑھ کر کون استاد ہے۔ فطرت خود ہر قدم پر انسان کی راہنمائی کرتی ہے۔ ماں بنتے ہی عورت کے اندر بتدریج تبدیلیاں اس طرح رونما کرتی چلی جاتی ہیں کہ ماں کی صلاحیت خودبخود ابھرتی چلی جاتی ہے۔ بس صرف ذہن کا فطرت سے رابطہ ہونا چاہئے۔ جب کوئی بندہ اپنے اندر کام کرنے والی فطرت سے رابطہ جوڑ لیتا ہے تو اس کا رابطہ اللہ تعالیٰ کے تفکر کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ خود اس کا ہر قدم پر محافظ بن جاتا ہے۔ اس طرح بندہ بھی اس کی حفاظت کو پہچان لیتا ہے۔

افشاں ابھی تقریباً سوا سال کی تھی کہ پڑوس کے کسی بچے سے اسے کالی کھانسی لگ گئی۔ یہ بڑی ظالم بیماری ہے۔ اپنی مدت پر ہی جاتی ہے۔ شروع شروع میں تو ہم اسے معمولی کھانسی سمجھ رہے تھے۔

پھر ڈاکٹر سے باقاعدہ علاج کرایا۔ افشاں کی کھانسی کو ڈیڑھ ماہ ہو چلا تھا، کبھی کبھی اس پر بڑی بری طرح کھانسی کے دورے پڑتے۔ ویسے یہ دورے کبھی کبھار ہی سخت ہوتے۔ مگر پھر بھی زیما اور سارے گھر والوں کو سخت فکر ہو جاتی۔ شیخ احمد نے دلاسہ دیا تھا کہ گھبراؤ نہیں اپنی مدت پر ختم ہو جائے گی۔ مگر ماں ہونے کے ناتے زیما بچی کے لئے اندر ہی اندر بہت فکرمند تھی۔

ایک دن زیما نے افشاں کو نہلا کر میری امی کے پاس لٹا دیا۔ دوپہر کو امی اس کے لے کر لیٹ گئیں۔ دونوں سو گئے اور زیما ظہر کی نماز کے بعد دعاؤں کی کوئی کتاب پڑھنے بیٹھ گئی۔ میں آفس میں تھا۔ ابو کام پر تھے۔ چچا بھی نہیں تھے۔ چچی اوپر والے کمرے میں تھیں۔ بس نیچے نعمان، افشاں، ممی اور زیما تھے۔ بعد میں مجھے زیما نے سارا واقعہ سنایا۔ ہوا یہ کہ کتاب پڑھتے وقت زیما کے ذہن میں بچی کی کھانسی کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اللہ نے مجھے کیوں پیدا کیا۔ نہ پیدا کیا ہوتا، تو کیا ہوتا۔ آج مجھے پریشانی تو نہیں ہوتی۔ اس وقت اس کا دل بچی کی کھانسی کی تکلیف کے احساس میں بالکل ڈوب گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دنیا میں تو کوئی نہ کوئی پریشانی لگی رہتی ہے۔ مجھے اللہ نے نجانے کیوں اس دنیا میں بھیج دیا۔ اس خیال کے دوران کتاب سامنے تھی۔ وہ پڑھ رہی تھی تو صفحہ کی آخری سطر پر لکھا تھا ''اور غور سے سنو کہ ہر انسان کی ذمہ کوئی کام دیئے گئے ہیں اور کسی کی تخلیق بلا سوچے سمجھے ہرگز نہیں کی گئی۔ پھر تم نادانی میں ایسا کیوں سوچتے ہو۔'' یہ پوری عبارت صفحہ کے آخری لائن پر آدھی تھی۔ اس کے بعد صفحہ پلٹ کر آخری حصہ تھا۔ اس کے پڑھتے ہی زیما کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے سینے میں صبر انڈیل رہا ہے۔ اس کی ٹھنڈک اس نے اپنے سینے میں محسوس کی۔ اس کو سکون ملا وہ جان گئی کہ اسے تسلی دی جا رہی ہے کہ وہ بچی کے لئے پریشان نہ ہو۔ وہ بار بار اس عبارت کو پڑھتی رہی۔ کتنی بار اس نے پڑھا۔ کیونکہ اس کو سکون اور تقویت مل رہی تھی اور وہ جان گئی تھی کہ یہ اللہ کی جانب سے اس کے لئے تسکین کا سامان ہے۔ پھر اس نے کتاب کا صفحہ اور سطر نمبر بھی اچھی طرح پڑھا اور بار بار دیکھا اور یاد کرایا کہ جب کبھی پریشانی ہو گی تو اس عبارت کو پڑھ لیا کروں گی تاکہ دل کو قوت حاصل ہو جائے۔

اب وہ آگے پڑھنے کے لئے دوسری سطر پر نظر ڈال رہی تھی۔ کہ ممی افشاں کو گود میں لئے چیختی چلی آئیں۔ زیما، افشاں کی سانس بند ہو گئی۔ اس وقت زیما نے فوراً بچی کو گود میں لے لیا۔ اس کی سانس بند ہو چکی تھی۔ چہرہ نیلا ہونے لگا۔ اس کے ذہن میں پڑھے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ وہ بالکل

چپ تھی ۔ جیسے سکتہ ہوگیا ۔ ممی نے کچھ آیت پڑھ کر اس پر دم کیا۔ اس کو ہلاتی رہیں ۔ چند منٹوں میں بچی کے سانس کا بہاؤ واپس آگیا ۔ ثریا کہنے لگی ۔ میں بالکل چپ چاپ اس اثناء میں دل میں اللہ پاک سے یہ التجا کرتی رہی کہ غلط خیال میرے ذہن میں آیا تھا مجھے معاف کردیں اور اس کے ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ اسی پریشانی کو برداشت کرنے کی سکت اس کے اندر ڈالی گئی ہو۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا ۔ مگر ڈاکٹر نے کہا کہ بچی بالکل ٹھیک ہے ۔ کھانسی کی وجہ سے ایسا ہوا تھا کیونکہ گہری نیند میں کھانسی آ گئی تھی ۔ تھوڑی دیر میں، میں آیا تو سارا واقعہ معلوم ہوا ۔ ثریا نے فوراً کتاب دکھائی کہ یہ دیکھئے میں یہ پڑھ رہی تھی ۔ اب جو صفحہ کھولا تو اس پر عبارت تھی ہی نہیں ۔ وہ سخت حیران ہوگئی ۔ بار بار آگے پیچھے صفحہ پلٹتی اور بار بار یہی کہتی کہ سلمان میں نے تو اچھی طرح صفحہ نمبر وغیرہ ذہن نشین کرلیا تھا تا کہ میں پھر پڑھ سکوں ۔ میں نے اسے گلے لگا کر تسلی دی ۔ اللہ احسن الخالقین ہے ۔ تم ماں ہو خالقیت کی ایک صفت تمہارے اندر بھی کام کر رہی ہے ۔ خالقیت کا مزاج ممتا کا ادراک ہے ۔ جب اس ادراک میں ہلچل مچی تو تسکین کا سامان کر دیا گیا اور تمہارے خیال کی تصحیح کر دی گئی ۔ آئندہ ایسا کبھی مت سوچنا ۔ دکھ سکھ تو زندگی میں آتے رہتے ہیں ۔ چچی نے اس دن شام کو بکرے کا صدقہ دیا ۔ پھر اس کے بعد افشاں کو کھانسی نہیں اٹھی ۔

کچھ دن بعد شیخ احمد نے فرمایا ۔ سلمان آج سے آپ گوشت کھانا بند کر دیں ۔ چالیس دن تک گوشت، انڈا، مچھلی بالکل بند کر دیں اور دودھ کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں ۔ اپنی خوراک میں زیادہ تر دودھ چاول رکھیں ۔ میں نے پوچھا سرکار دودھ میں کیا خاص بات ہے ۔ اس سے مجھے کیا روحانی فائدہ ہوگا ۔ فرمایا ۔ تم نے معراج کا واقعہ پڑھا ہوگا ۔ جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت جرائیل علیہ السلام کے ساتھ معراج پر تشریف لے گئے تو سدرۃ المنتہیٰ کے مقام پر حضرت جرائیل علیہ السلام نے اللہ پاک کے حکم پر آپ ﷺ کو تین پیالے پیش کئے ۔ ایک پیالہ میں دودھ تھا، دوسرے میں شراب اور تیسرے میں پانی تھا ۔ آپ ﷺ سے فرمایا گیا کہ اس میں سے ایک کو پینے کے لئے منتخب کرلیں ۔ آپ ﷺ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا اور اسی وقت حضرت جرائیل علیہ السلام نے فرمایا۔ آپ ﷺ نے فطرت کو اختیار کیا ۔ شیخ احمد نے فرمایا، سلمان بیٹے آپ نے قرآن پڑھا ہے ۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآن میں فطرت کا کیا مفہوم ہے ۔ سورہ روم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

ترجمہ:

”پس آپ کرلیں اپنا رخ دین حنیف کی

طرف پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ کی فطرت
کو جس کے مطابق اس نے لوگوں کو پیدا
فرمایا۔کوئی ردو بدل نہیں ہوسکتا اللہ کی تخلیق
میں۔ یہی سیدھا دین ہے۔لیکن اکثر لوگ
نہیں جانتے''

(سورہ روم آیت ۳۰)

اس آیت میں واضح طور پر یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔فطرت اسمائے الٰہیہ کی صفات ہیں۔ انسان اور کائنات کی ہر تخلیق اسمائے الٰہیہ کے انوار و روشنیوں سے ہوتی ہے۔ ہر شئے کے اندر اسمائے الٰہیہ کی روشنیوں کی معین مقداریں کام کر رہی ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں ہے۔دین قیم (سیدھا دین) اسمائے الٰہیہ کےعلوم کا جاننا ہے۔اسمائے الٰہیہ کے علوم کائناتی تخلیقی اور تکوینی امور میں معراج میں حضور پاک ﷺ کو تین پیالے پیش کئے گئے۔ ایک دودھ کا، دوسرا شراب کا، تیسرا پانی اک دودھ فطرت کی تمثیل ہے۔شراب گمراہی کی تمثیل ہے اور پانی مادہ کی تمثیل ہے۔جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہم نے ہر شئے کو مادہ سے بنایا۔فطرت اسمائے الٰہیہ کی روشنیاں ہیں۔جن کے علوم آدم یعنی انسان کو عطا فرمائے۔معراج میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا پیالہ پسند کیا۔یعنی آپ ﷺ نے اسمائے الٰہیہ کے علوم اپنے لئے اختیار و پسند فرمائے۔سلمان بیٹے! حضور پاک ﷺ کا ہر عمل سنت کے قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔تم نے دودھ کا مفہوم و معنی جان لیا ہے۔اب اپنے دل و دماغ میں اس مفہوم و معنی کو رکھ کر اس سنت نبوی پر عمل کرو اور اپنی خوراک دودھ بنا لو۔جیسا کہ بچہ اللہ تعالیٰ کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور فطرت نے بچے کے لئے پہلی غذا دودھ ماں کے سینے میں اتار دی ہے۔اس غذا سے تمہارے اندر موجود تمام حواس اپنی فطرت کے مطابق کام کریں گے اور تمہارے اندر روحانی صلاحیتیں مزید پیدا ہوں گی، انشاءاللہ۔

شیخ احمد نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔میں نے دوسرے دن سے ان کی ہدایت پر عمل شروع کر دیا۔شروع کے چند دن تو میرا دل چاہتا نمک مرچ کھانے کو گوشت کھانے کو، کبھی پھیکا دودھ پیتا، کبھی تھوڑا سا شہد ملاتا تھا۔چار پانچ دن کے بعد میرا ذہن دودھ پر سیٹ ہوگیا اور نمک مرچ اور گوشت کی جانب سے ہٹ گیا۔اس مخصوص خوراک کے ساتھ ساتھ آدھی رات کو اٹھ کر مراقبہ کرنے کا

بھی حکم مرشد کریم کی جانب سے تھا۔ کیونکہ کافی دنوں سے میں بس فجر کے وقت ہی اٹھتا تھا اور رات کی عبادت چھوٹی ہوئی تھی۔

اب میں رات کو دس گیارہ بجے تک سو جاتا اور تقریباً دو بجے اٹھ کر چھت پر اس مخصوص کمرے میں جا بیٹھتا۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک پر اسراریت سی ماحول میں محسوس ہوتی اور دل و دماغ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ وابستہ ہو جاتا۔ شروع کے چار یا پانچ دن تو معمول کے مطابق رہے۔ پھر ساتویں دن جب نماز تہجد کی نفلیں پڑھ رہا تھا تو ایک دم مجھے نور کے سمندر کا شعور سنائی دیا۔ جیسے ساحل سمندر سے موجیں زور زور سے ٹکرا رہی ہیں۔ اس کے اگلے لمحے ہی نظر کے سامنے ایک دم سے پردہ ہٹ گیا۔ نماز میں میری آنکھیں بند تھیں مگر بند آنکھوں کے سامنے نہایت واضح اور روشن سین آگئے میرے سامنے پورا گھر آ گیا۔ میری نظریں گھر کے اندر ہر کمرے کا بیک وقت منظر دیکھ رہی تھیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح حقیقت میں تھا۔ کہاں کون سو رہا ہے۔ کیا شئے کس طرح رکھی ہوئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس پورے گھر میں دودھ کا دریا اس کی موجوں میں اس قدر روانی اور قوت تھی جیسے سمندر ہو۔ جہاں میں تھا اس جگہ بھی دودھ ہی دودھ بہہ رہا تھا۔ سفید شفاف تازہ دودھ۔ اس کی شیریں خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں اپنے ظاہری حواس میں اس خوشبو کو سونگھ رہا تھا بہت دیر تک نماز میں، میں دودھ کا دریا اسی طرح دیکھتا رہا۔ پھر نماز کے بعد جب مراقبہ میں بیٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھر کے نیچے کی منزل سے یہ دریا سمٹا جا رہا ہے اور اس کا سارا دودھ ایک بہت بڑی سی موج یا لہر بن گیا ہے۔ یہ لہر میری جانب آ رہی ہے۔ یہ نیچے کی منزل سے پہلی منزل پر آئی اب پہلی منزل کا سارا دودھ اس لہر میں داخل ہو گیا۔ پھر یہ لہر تیسری منزل پر آئی۔ تیسری منزل کا سارا دودھ فرش سے اٹھ کر اس موج یا لہر میں داخل ہو گیا۔ اب یہ لہر چھت پر آ گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سارا گھر اب دودھ کے دریا سے خالی ہو گیا۔ یہ سارا اب ایک موج بن گئی جو بہت بڑھ دھارے کی صورت ہے۔ اب یہ دھارا میری پشت کی جانب آیا۔ چھت کا سارا دریا بھی اسی دھارے میں شامل ہو گیا۔ یہ دھارا میری پشت سے میرے اندر سما گیا۔ جیسے میری پشت نے اس دریا کو نگل لیا۔ پشت میں یہ دریا گدی کے مقام سے اندر داخل ہو گیا۔ اب میں اپنے جسم کے اندر دودھ کے دریا کو پوری روانی کے ساتھ بہتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میرا پورا جسم دودھ کی میٹھی میٹھی خوشبو سے مہکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میرے لعاب دہن میں دودھ کا شیریں مزا حلاوت کر گیا۔

میری آنکھیں خود بخود مراقبہ میں کھل گئیں۔ نگاہ سامنے دروازے پر جم گئی۔ کھلی آنکھوں نے دیکھا کہ دروازے پر دادی اماں کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ دودھیا رنگ کا لباس پہنے یوں لگ رہی تھیں جیسے ابھی ابھی دودھ کے دریا سے نکل کر آ رہی ہیں۔ میرا جسم ونظر بالکل ساکت تھے۔ مگر روح اندر ہی اندر ان سے مخاطب تھی۔ السلام علیکم دادی اماں۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ سلمان تم میرے بیٹے ہو مجھے تم پر ناز ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے دودھیا چادر ایک قدم آگے بڑھ کر مجھ پر ڈال دی جیسا وہ اکثر بچپن میں مجھے اپنے چادر سے ڈھانپ دیا کرتی تھیں۔ میرے تمام حواس نے چادر کی ملائمت کو محسوس کیا، پھر اگلے لمحے یوں لگا جیسے میں جسم کے ساتھ دودھ کے دریا میں ڈوب گیا ہوں۔ اب دادی اماں غائب تھیں۔ میری آنکھیں خود بخود مراقبہ کے لئے بند ہوگئیں۔ میں اپنے آپ کو دودھ کے دریا میں اندر ہی اندر تیرتا دیکھتا رہا۔

اب ہر روز رات کو نور کا ایک مختلف دریا میرے اندر سماتا دکھائی دیتا۔ اس نور کو میرے تمام حواس کے ذریعے متعارف کرایا جاتا۔ اس کے نور کا رنگ اس کی بو۔ اس کا ذائقہ اس کا لمس اس کی خاصیت یا کمال، اس طرح ایک ایک کر کے چالیس نور کا تعارف مجھے ظاہری حواس میں کرایا گیا اور انیس سو انوار میرے حواس میں داخل ہوتے ہوئے دکھائے گئے کہ میں ظاہری عقل وشعور سے انہیں پہچان نہ سکا۔ پھر ایک رات بتایا گیا کہ ستر ہزار انوار آپ کے اندر ڈالے گئے ہیں۔ یہ بھی صرف ایک اطلاع تھی۔ میرے عقل وشعور نے انہیں اندر ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں پہچان گیا کہ یہ تمام انوار اسمائے الٰہیہ کے انوار ہیں۔ جن سے میری روح کی تخلیق ہوئی ہے۔ ان انوار کے رنگ روح کی صلاحیتیں ہیں اور ان رنگوں سے پیدا ہونے والی قوت روح کا ادراک اور کمالات ہیں۔ روح کے ادراک کا ایک اور کمال کا ظہور ازل سے ابد تک کے دائرے میں ہے۔ انہی کمالات کا تنزل کائنات ہے۔ اس مخصوص خوراک کے ساتھ مجھے ایک ماہ ہوگیا۔ میرا جسم اس قدر ہلکا اور حواس اس قدر لطیف محسوس ہوئے کہ جو کچھ خیال میں آتا سب جلد واقعتاً رونما ہو جاتا۔

ایک رات مراقبہ میں بیٹھا تو جسم کا ایک ایک رواں میری نگاہ میں آ گیا۔ ہر رواں بال کی جگہ روشنی کی ایک شعاع بن گیا۔ جسم کے اندر نظر گئی۔ جسم ایک باریک کھال کا اور جالی دار تھا۔ ہر سوراخ سے روشنی نکل رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں ایک تراشہ ہوا ہیرا ہوں۔ میرے جسم کا ہر مسام ہیرے کا تراشہ ہوا ایک کونہ یا زاویہ ہے اور اس زاویہ سے شعاعیں نکل رہی ہیں۔ ہر زاویہ سے ایک

رنگ کی روشنی نکل رہی ہے۔ یہ سارے رنگ خود ہیرے کے اندر ہی موجود ہیں۔ میرے ذہن میں حدیث قدسی کی آواز گونجنے لگی۔

''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ جب میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے کائنات کی تخلیق کی۔'' مجھے یوں لگا کہ میرا عشق دل بن کر میرے سینے میں سما گیا ہے۔ دل بے اختیار کہہ اٹھا۔

''اے میرے محبوب! میں اپنے وجود کی ہزاروں آنکھوں سے تجھے دیکھوں گا۔ تو اسی لائق ہے کہ جسم کا ہر رواں آنکھ بن کر تجھے دیکھے۔ پھر بھی تیرے جمال کی تعریف کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔ میرے جسم اور روح کے ہر ذرے کو نظر بنا دے تا کہ میں تیرا دیدار کرتا رہوں۔''

مجھے گوشت چھوڑے ہوئے اب پورے چالیس دن ہو گئے تھے۔ میرا یہ چلہ آج ختم ہو گیا تھا۔ مجھے اپنا جسم بہت لطیف سا محسوس ہوتا اور آنکھوں میں بھی مقناطیسیت محسوس ہوتی۔ اس مقناطیسی قوت کو زیبا اور گھر کے تمام افراد نے محسوس کیا۔ ایک ہفتے سے میں یہ بات نوٹ کر رہا تھا کہ آفس میں چند لوگ اکثر میرے کاموں پر بلاوجہ اعتراض کر دیتے تھے۔ اب یہ سب لوگ مجھ سے اچھی طرح ملا کرتے۔ میرے پاس آ کر خوشی محسوس کرتے۔ ان کے اعتراضات تو قطعی ختم ہو چکے تھے۔ مجھ پر یہ اسرار کھلا کہ اللہ پاک کی بینائی کا نور جو کہ اسم بصیر کی تجلی ہے۔ اس نور کے اندر مقناطیسی کشش اللہ کی کائنات کے ذرے ذرے میں کام کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر پہاڑ کی تہہ میں چھپا ہوا رائی کا چھوٹا سا دانہ بھی دیکھ سکتی ہے۔ یعنی اللہ پاک کی نظر یا بینائی کا نور کائنات کے ذرے ذرے کو محیط ہے۔ اس نور نے اپنی قوت کشش کے ساتھ کائنات کے ذرے ذرے کو جوڑ رکھا ہے۔ اس کی مقناطیسی کشش قوت ثقل بن کر زمین میں کام کر رہی ہے۔ اسی نور نے تمام اجزائے فلکی کو اپنے اپنے مقام پر سنبھالا ہوا ہے۔

رات کو میں مرشد کریم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہیں چلہ ختم ہونے کی اطلاع دی اور اپنی واردات و کیفیات بتائیں۔ شیخ احمد بہت خوش ہوئے۔ فرمایا۔

''بیٹے! اللہ پاک کی نظر کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہے۔ روح کی آنکھ اللہ کی نظر کا واسطہ ہے۔ روح کی آنکھ ازل سے ابد تک دیکھتی ہے۔ روح تین دائروں پر مشتمل ہے۔ یہ تینوں دائرے روح کی تینوں ہستیاں ہیں۔ جو اپنی ذات میں علیحدہ علیحدہ مکمل صورت میں ہیں۔ روح کا پہلا دائرہ ذات کی تجلی کا ہے۔ اس دائرے کو اللہ کا نور یا بینائی کا نور کہا جاتا ہے۔ باقی دو دائرے روح کا نفس ہیں۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ

''اول آخر ظاہر باطن میں ہی میں ہوں ۔''

پس باطن یعنی غیب میں اللہ کی تجلیات و انوار ہیں ۔ اور ظاہر میں ان انوارات اور تجلیات کی روشنیاں ہیں ۔ ظاہر اور باطن کے درمیان برزخ یا پردہ ہے ۔ جو ظاہر کو باطن سے جدا کرتا ہے ۔ برزخ باطن کو ظاہر کرنے کا واسطہ ہے ۔ جب روح کی نظر اور فکر اپنے نفس سے گزر جاتی ہے تو ایک ایسا مقام آتا ہے جہاں روح کی نظر کی ڈائمینشن ختم ہو جاتی ہے ۔ نظر سے ڈائی مینشن کا ختم ہو جانا خود اپنی ذات کی فنائیت ہے ۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے آپ ریت کا محل بناتے ہیں ۔ اب اسے توڑ دیتے ہیں اور توڑنے کے بعد کہتے ہیں کہ محل فنا ہو گیا ۔ مگر فنا ہونے سے پہلے بھی ریت تھی اور فنا ہونے کے بعد بھی ریت ہے تو محل کیا ہے ۔ محل ریت کے مختلف ڈائی مینشن ہیں ۔ جنہوں نے محل کی صورت بنا لی ۔ یہ ڈائی مینشن ختم ہو گئے تو محل بھی فنا ہو گیا ۔ محل کے فنا ہونے پر اصل ذات سامنے آئی ۔ اب محل کا تذکرہ نہیں بلکہ صرف ریت کا تذکرہ ہے ۔ پس جب انسان کی نظر اور ذہن کے ڈائی مینشن ختم ہو جاتے ہیں گوشت پوست سے ہٹ کر اصل انسان سامنے آتا ہے ۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی اسی روحانی صلاحیت کی قسم کھائی ہے ۔ میں نے شیخ احمد سے کہا کہ:

''سرکار اس کا مطلب تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کائنات کی تمام صورتیں روح کی فکر کا نتیجہ ہیں ۔ کیونکہ جب روح کی اپنی ذات کی نفی ہو گئی ہے تو ساری کائنات کی نفی ہو گئی ہے ۔''

کہنے لگے ۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ روح امر ربی ہے اور اللہ کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کر لیتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا ، وہ ہو جاتی ہے ۔ پس کائنات کی تمام صورتیں اللہ تعالیٰ کے امر یعنی روح کے دماغ و نظر کے خاکے ہیں ۔ اس کی تشریح یوں ہو گی کہ روح کی نظر یا آنکھ اللہ تعالیٰ کی تجلی کو بے شمار زاویوں سے دیکھتی ہے ۔ ہر زاویہ نگاہ کائنات کا ایک ڈائی مینشن ہے ۔ جو مادی دنیا میں کائنات کی اشکال میں ظاہر ہو جاتے ہیں ۔ روح کی نگاہ جب اپنی روشنی میں دیکھتی ہے تو وہ کائنات کی اشکال دیکھتی ہے مگر جب اللہ کی امر کی تجلی میں دیکھتی ہے تو صرف ذات کی تجلی سامنے آتی ہے ۔ یہ نظر کے دیکھنے کے دو رخ ہیں ۔ ایک مظاہر میں دیکھنا اور دوسرا علم میں دیکھنا ۔ مظاہر میں دیکھنا کائنات میں موجودات کو دیکھنا ہے ۔ علم میں ان موجودات میں کام کرنے والی اور ان کو حرکت میں رکھنے والی روشنیوں کو دیکھنا ہے ۔ علم میں دیکھنا اللہ تعالیٰ کے اسرار و رموز اور حکمتوں کو پہچاننا ہے اور یہی اسرار و مظاہر قدرت کی بنیاد ہیں ۔ شیخ احمد نے فرمایا اب تم ذہنی طور پر اس مقام پر پہنچ چکے ہو کہ ان اسرار و انوار سے واقفیت حاصل کر سکو ۔

اب تم پر اللہ تعالیٰ کے اسرار و رموز کھلتے جائیں گے۔ اب تم قرآن کی آیت میں غور و فکر کیا کرو تا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں تمہیں معلوم ہو سکیں۔ پھر فرمایا۔ اللہ پاک فرماتے ہیں:

"میری نشانیوں کو مت جھٹلاؤ۔"

اس کا مطلب ہے۔ میرے ذہن میں فوراً ہی بات یہ آئی .... میں نے کہا کہ تمام مظاہر کائنات اللہ پاک کی نشانیاں ہیں۔ اللہ کی آیات اللہ کا علم ہے اور اللہ کی نشانیاں اس کے علم کی ظاہری صورت ہے۔ فرمایا۔ بس اب اسی فکر و ذہن کے ساتھ قرآن پڑھو۔ تا کہ اللہ کی نشانیاں تم پر ظاہر ہو جائیں۔ میں نے انتہائی شوق سے شیخ احمد کے قدم چومے۔ اس لمحے میرے قلب و نگاہ میں ایک بجلی سی کوندی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "حضور آپ میرے اللہ کی نشانی ہیں۔"

دن بدن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں ایک گہرا سمندر ہوں۔ جس کی لہریں سطح پر بالکل پرسکون ہیں۔ مگر سطح کے نیچے سمندر کی قوت ہزاروں طغیانیوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ میں وہ سمندر ہوں جس کا ایک قطرہ سارے عالم کو سیراب کر دے گا۔ میں وہ سورج ہوں جس کی ایک شعاع سارے عالمین کو روشن کر دے گی۔ میں وہ درد ہوں جس کی ایک آہ سارے اہل دل کو کرب میں مبتلا کر دے گی۔ میں وہ آگ ہوں جس کی ایک چنگاری باطل کے تمام خرمن جلا کے خاک کر دے گی۔

یہ کیسی آگ ہے جس میں میرا تن من جل رہا ہے۔ میرا ہر سانس تیری ہویت کا اقرار ہے۔ میری ہر دھڑکن تیری احدیت کا اعلان ہے۔ میری ہر حرکت تیری محبوبیت کا انکشاف ہے۔ اب تیرے سوا مجھے کون قبول کرے گا۔ پہاڑ زمین آسمان میرے متحمل نہیں ہیں۔ میں تیری امانت ہوں۔ میرے دل کے قریب میں ایک سرگوشی سنائی دی۔ "اے میرے بندے تو میری امانت ہے۔ تیری حفاظت میرے سوا اور کون کر سکتا ہے۔" بڑھتے طوفان میں سکون کی لہریں پیدا ہو گئیں۔ دھوپ میں جلتی زمین پر ابر باراں کی گوہر فشانی ہو گئی۔ آج مجھ پر یہ بھید کھلا کہ اللہ پاک نے اپنی امانت کا عشق میرے اندر رکھا۔ آدمؑ کے سوا کوئی اس امانت کو اٹھانے کا متحمل نہیں ہو گا۔ اپنی امانت کے بوجھ کو اٹھانے کے لئے اللہ پاک نے آدمؑ کو علم عطا فرمایا۔ اسی علم کی قوت سے آدم مخلوق پر حکمرانی کرتا ہے۔ میرے دل میں خود بخود اسرار کھلتے رہے۔ ذہن میں اللہ پاک کی قربت کے سوا کوئی خیال نہیں آتا۔ حالانکہ ہر کام معمول کے مطابق کرتا مگر ہر وقت یوں لگتا کہ جیسے اللہ ہر وقت میرے اپنے اندر موجود ہو۔ میرے اپنے اندر سے اس کا جلوہ نور دکھائی دیتا تھا اس وقت میری یہ حالت تھی کہ جس حالت کے لئے اللہ پاک اپنے کلام میں

فرماتے ہیں۔

ترجمہ:

''میں تمہارے نفسوں میں ہوں کیا تم نہیں دیکھتے۔''

یہی صلوٰۃ دائمی ہے کہ جس میں نظر اپنے نفس سے ہٹ کر اللہ پاک پر قائم ہو جائے۔ ایسی حالت میں بندے کا سونا جاگنا، چلنا پھرنا، سب عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ نزیما نے انہی دنوں دو تین بار مجھے بتایا کہ جب آپ گہری نیند میں ہوتے ہیں تو سانس کے ساتھ آپ کے سینے سے اللہ اللہ کی آواز بڑی صاف سنائی دیتی ہے۔ حالانکہ مجھ کو اس کی خبر نہیں تھی۔ مگر ایک بار ایسا ہوا کہ خود اپنی ہی اللہ اللہ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں سوچنے لگا انسان اپنی ذات میں بڑی دلچسپ شخصیت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پر اسرار بھی۔ روحانی علوم کیسے دلچسپ ہیں۔ جس میں ہر روز نت نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ اور آدمی کے اندر کے تجسس کو روحانی علوم سے کس قدر تسکین ملتی ہے۔ اس کی جستجو اور تلاش کو نیا راستہ مل جاتا ہے۔ مجھے اللہ میاں پر بہت پیار آیا کہ انہوں نے اپنے بندوں کے لئے کیسے سامان مہیا کئے ہیں۔ اس کے ساتھ اس بات کا دکھ ہوا کہ اپنی فطرت کے خلاف لوگ محدودیت یعنی مادیت سے ہی جی لگا بیٹھتے ہیں۔ مرنے کے بعد مادی دنیا ختم ہو جائے گی پھر اپنی فطرت میں بسی ہوئی قوت تجسس کو کس عالم میں لے جائیں گے۔ جب اسے تلاش کی زمین نہیں ملے گی تو وہ کہاں خزانے ڈھونڈنے جائے گی۔

دل جب محبوب کے ساتھ لگ جاتا ہے تو سب کچھ محبوب ہی ہو جاتا ہے۔ ان دنوں کمپنی میں سالانہ اکاؤنٹ کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ سارا دفتر مصروف تھا۔ میں بھی سارا سارا دن کمپیوٹر پر کام کر کے تھک گیا تھا۔ رات کے آٹھ بجے چھٹی ملی۔ دماغ تھک گیا تھا۔ گھر آ کر کھانا کھا کر صوفے پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے بڑا آرام ملا اور یہ آرام سکون میں بدل گیا بند آنکھوں کے سامنے ایک فلیش لائٹ چمکی۔ اس کے ساتھ ہی خیال کا رخ بدل گیا۔ مجھے اپنے رب کی قربت محسوس ہوئی کچھ دیر بعد اس احساس نے سچ مچ میرے شعور کو اپنے اندر سمیٹ لیا اور میں گہری نیند میں چلا گیا۔

جاگنے پر دل میں خیال آیا کہ سالک کا دل اور ذہن جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے تو وہ ہر شئے میں ذات حق کو ظاہر اور مخلوق کو باطن میں دیکھتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ تمام جمیع خلائق حق کا آئینہ ہے۔ اللہ پاک نے الست بربکم کہہ کر خلق کے آئینوں کو اپنی ذات کا نقش کر دیا۔ آئینے میں حق کا نقش مخفی تھا۔ مگر جب ظہور میں آتا ہے تو وہی تو ظہور میں آئے گا۔ جو عکس آئینہ میں ہے۔ میں پہچان گیا۔

میری روح آئینہ حق ہے۔ وہ اپنے آئینے میں حق کا ظہور دیکھ رہی ہے۔ جب روح کی نگاہ کا انہاک آئینہ کے عکس میں حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے عکس کی شعاعیں جس شئے پر پڑتی ہیں روح کی نظر اس شئے میں نور کا مشاہدہ کر لیتی ہے۔ جیسے سورج کی شعاعیں جب زمین پر نزول کرتی ہیں تو ہر شئے دھوپ کا اثر قبول کر لیتی ہے۔ اللہ کی ذات تو نور ہے۔ وہ نور جو ازل نے تمہاری روح میں دیکھا تھا۔ اور دل نے اس کا اقرار کیا تھا۔ وہ نور اپنی ذات میں کامل ہے۔ یعنی ازل سے ابد تک نور کے ہر ادراک میں اس کا عکس کامل موجود ہے۔ یہ اور بات ہے عقل عکس کو دیکھنے سے اندھی ہو۔ دل نے عقل سے کہا مگر تم اس بات کا اقرار تو کر ہی رہی ہو کہ وہ عکس تمہارے آئینے میں موجود ہے۔ عقل بولی میں اندھی ضرور ہوں مگر ایمان کی حرارت کو محسوس کر سکتی ہوں۔ دھوپ میں آنکھ بند کر کے لیٹنے والے کو دھوپ دکھائی تو نہیں دیتی مگر وہ محسوس ضرور کر لیتا ہے۔

میں نے دل سے پوچھا اے دل تو کون ہے۔ دل نے کہا آئینہ ہوں۔ عقل سے پوچھا تو کون ہے۔ وہ بولی میں آئینہ کا ادراک ہوں۔ آئینے میں عکس کی روشنی جہاں جہاں پھیلتی ہے۔ میں اسے جان لیتی ہوں۔ مگر تم کو معلوم ہے کہ دل کے آئینے کے اندر عکس کی ہر روشنی کا ایک کامل عکس ہے۔ جس پہچان گیا کہ میرے شعور کا رابطہ اور فراست سے ہو گیا ہے۔ یہ نور فراست کی فکر ہے۔ اب میں نے اس نوری عقل سے سوال کیا، ادراک کیا ہے؟ وہ بولی لمحۂ کن ہے۔ وہ وقت ہے جس وقت دل کے آئینے نے حق کے عکس کو دیکھا۔ دل کے آئینے میں بس وہی ایک عکس تو ہے۔ آئینہ وہی دیکھ رہا ہے جو اندر موجود ہے۔ لمحۂ کن کی ہر یونٹ ادراک ہے اور ہر یونٹ خواہ وہ چھوٹی سے چھوٹی کیوں نہ ہو آئینے کا ایک عکس ہے۔ ذات ایک ہے۔ عکس بے شمار ہیں۔ یہ صفات کی صورت میں جلوہ گر ہیں جیسے کیمرہ ایک شئے کی تصویر لیتا ہے وہ ایک ہی شخص کی بیس تصویریں لے لیتا ہے۔ ہر تصویر مختلف لگتی ہے مگر ذات ایک ہی ہے ادراک لمحہ کن کی یونٹ ہے اسے جتنا پھیلائیں گے اس کے اندر کے عکس سامنے آتے جائیں گے۔ میں سوچنے لگا کہ آئینے کو وسعت کیوں نہ دے دی جائے کہ نظر کا ہر عکس ایک ذات کی مختلف تصویریں یا فوٹو بن جائیں۔ حقیقت کو جاننے کے بعد میرا دل گہرائی میں ڈوبنے لگا۔ دل اب ہر لمحہ زندگی کا ادراک طلب کرنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں وہ پیاسا ہوں جس کے لب تک پانی لا کر لوٹا دیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کے انکشاف پر کچھ سمجھ نہیں آتا کہ میں روؤں یا ہنسوں۔ میرا تو رواں رواں دکھتی رگ ہے جس میں ہجر و فراق کا درد بسا ہے۔ یہ چند لمحے میرے درد کا مداوا کیسے ہو سکتے ہیں۔ میں تو ازل سے ابد

تک محبوب کو آئینہ دل میں دیکھ رہا ہوں ہر نظر کے ساتھ تقاضۂ وصال بھڑک اٹھتا ہے۔ خواہش عمر بھر کا سفر کرتی ہے۔ تب کہیں جا کر اس کی تسکین کا سامان ہوتا ہے۔ مگر یہ وصال عمر کب ہے۔ یہ تو عمر کا ایک لمحہ ہے۔ پھر وہی پردہ ہے۔ پھر وہی حجاب ہے۔ پھر وہی تشنگی۔ اے حقیقت منتظر! میرا جی چاہتا ہے کہ میں تیری آغوش رحمت میں اس طرح سو جاؤں کہ پھر کوئی مجھے نہ جگائے۔ روح پیاسی ہے، تن پیاسا ہے، من پیاسا ہے، میں کیا ہوں بس کاسۂ گدا۔ کشکول میں تیری جو مرضی ڈال دے۔ کشکول کو اپنی رضا سے کیا کام۔

ان دنوں مجھ پر عجیب کیفیات طاری رہتیں جیسے میں خود اپنی ذات میں گم ہوں جیسے حقیقت میں میری ذات دنیا میں نہیں بلکہ عالم لطیف میں بستی ہے اور میں اس عالم لطیف سے دنیا کے جسم کو چلتے پھرتے دیکھتا رہتا ہوں۔ دنیا کی ہر حرکت خالی خالی لگنے لگی۔ جیسے لباس بغیر جسم کے۔ مگر دنیا سے بیزاری کا احساس مجھے کبھی نہیں ہوا اس کے برعکس میں اس بات سے خوش تھا کہ دنیا کے تمام فرائض اور مشاغل کی تکمیل کے ساتھ ساتھ دنیا سے میرا ذہن ہٹ بھی گیا ہے۔

اب میرا ذہن ہر وقت روحانی علوم میں چلتا رہتا۔ نظر جس شئے پر ٹھہر جاتی دل اس کی غیر معمولی تاویلات پیش کرتا۔ ہر نئی بات پر نئے انکشاف پر میری جبیں اپنے رب کے سامنے جھک جاتی اور مرشد پاک کی توقیر و عزت اور زیادہ بڑھ جاتی۔ اس کے ساتھ ہی دادی اماں بھی خیالوں میں دبے پاؤں چلی آتیں میں سوچتا۔ بچپن کی تربیت سب سے زیادہ ضروری ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے مادی دنیا آباد ہے اور آنکھوں کے سامنے پردۂ تخیل کی دنیا۔ آج دونوں عالم روشن ہیں۔ پس پردۂ تخیل کا عالم وسیع دکھائی دیتا ہے۔ مادی دنیا اس عالم کی تمثیل ہے میرا روحانی شعور اس عالم تمثیل کی ہر من بھاتی شئے کو عالم تخیل کی زینت بنائے جاتا ہے اور جو جو شئے پسند نہیں ہے اسے چن چن کرا لگ رکھتا جاتا ہے۔ میرا عالم تخیل میری جنت ہے۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی جنت کی تعمیر میں لگا ہوں۔ میری جنگ کا رنگین دریا میری دادی اماں ہیں۔ جن کے وجود سے جنت میں رنگینی ہے۔ دادی اماں میری جنت کی رنگین کہانی ہیں۔ ابدی جنت کی ایک ناختم ہونے والی کہانی۔ زیما میری جنت کا حسین نغمہ ہے۔ اس کی بازگشت جنت کے باغوں کی ہر شاخ سے سنائی دیتی ہے۔ پھولوں سے لدی ہوئی شاخوں پر خوش الحان پرندے ہمارے عشق کی راگنیاں سناتے ہیں جس کی دھن پر جنت کا ذرہ ذرہ مستی میں جھوم اٹھتا ہے اور مرشد کریم وہ ذات محبوب ہے جو میرے سارے عالم تخیل پر محیط ہے۔ جو دل کا نور ہے۔ مرشد کریم کی ذات گویا

نور کا ایک دریا ہے۔میری ذات اس دریا کا ایک موتی ہے۔اس موتی کے جگر میں ایک داستان ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والی داستان۔دریا کی ہر لہر پر ابھر ابھر کر وہ موتی اپنی داستان سنا رہا ہے۔قطرے سے گہر بننے کی کہانی۔ایک انمٹ کہانی۔اس کا ہر حرف خود گوہر ہے۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک